خونی ایجاد

تحریر: اشتیاق احمد

محمود☆فاروق☆فرزانہ

اور انسپکٹر جمشید سیریز

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

انٹرنیٹ ایڈیشن سال 2006   www.Nayaab.Net

خطرے کی بو

محمود، فاروق اور فرزانہ پروفیسر داؤد کے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کرسیوں پر شائستہ اور پروفیسر موجود تھے۔ آج پروفیسر صاحب نے شائستہ کے کہنے پر انہیں شام کی چائے پر بلایا تھا۔ ابھی چائے نہیں آئی تھی اور وہ اس وقت باتوں پر گزارا کر رہے تھے۔

انکل! آج کل آپ کس چیز پر تجربات کر رہے ہیں۔ محمود کہہ رہا تھا۔

ان دنوں میں چھٹی پر ہوں اور سوچ رہا ہوں، اب کیا کروں؟ پروفیسر نے جواب دیا۔

جی ! کیا مطلب...... آپ چھٹی پر ہیں ...... ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ

کسی کے ملازم نہیں۔ فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

ہاں! بے شک کسی کا ملازم نہیں ...... کسی چیز پر کوئی تجربہ نہیں کر رہا، نہ ہی کوئی ایجاد کرنے کے موڈ میں ہوں، بس آرام کر رہا ہوں اور جب میں آرام کرتا ہوں تو خود کو چھٹی پر خیال کرتا ہوں۔ پروفیسر داؤد بولے۔

بہت خوب! آپ نے بہت دنوں سے ہمارے لیے کوئی چیز نہیں بنائی، ہمارے پاس جو چیزیں ہیں، وہ بہت پرانی ہو چکی ہیں اور جرائم پیشہ لوگ ان سے واقف ہو چکے ہیں ...... اور وہ بچاؤ کی ترکیب کر لیتے ہیں، اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ کچھ نئی قسم کی چیزیں ہمارے لیے بنا دیں۔ فاروق نے فرمائش

کی۔

اچھی بات ہے ، چھٹی ختم ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔ پروفیسر مسکرائے۔

اور آپ کی چھٹی کب ختم ہو گی۔ فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

کچھ کہہ نہیں سکتا، یہ چھٹی آج اور اسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے، دو دن بعد بھی ختم ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ماہ یا ایک سال تک ختم نہ ہو۔ وہ کہتے چلے گئے۔

اوہ! یہ عجیب چھٹی ہے۔ فاروق کے منہ سے نکلا۔

یار کبھی تو سوچ سمجھ کر بول لیا کرو، بھلا چھٹی بھی عجیب ہو سکتی ہے۔ محمود جھلا کر بولا۔

عجیب ہی نہیں، غریب بھی ہو سکتی ہے، کم از کم پروفیسر انکل کی ضرور عجیب و غریب ہے۔ فاروق مسکرایا۔

ہاں! فاروق ٹھیک کہتا ہے، دراصل یہ چھٹی میرے موڈ کی چھٹی ہے ،ان دنوں کام کرنے کا موڈ نہیں ہے، جب بھی موڈ بن گیا، چھٹی ختم۔

کاش! ہم بھی ایسا چھٹیاں کرنے کے قابل ہوتے۔ فاروق نے سرد آہ بھری اور شائستہ بے ساختہ مسکرائی۔

تم تو ٹھہرے کام چور۔ فرزانہ بولی۔

گویا اس طرح چھٹیاں کرنے والے کام چور ہوتے ہیں تو پھر پروفیسر انکل ...... فاروق کہتے کہتے رک گیا اور فرزانہ جھینپ کر رہ گئی۔ پروفیسرداؤد نے ایک قہقہہ لگایا۔

بہت اچھے! تم نے مجھے بھی کام

چور ثابت کر دیا۔ انہوں نے کہا۔

یوں تو ہم ہر روز ہی کچھ نہ کچھ ثابت کرنے کے چکر میں رہتے ہیں لیکن کم از کم یہ بات ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فاروق بولا۔

بہت شریر ہو گئے ہو۔ پروفیسر ہنسے۔

جی نہیں تو ...... بس معمولی سا ہوں، آپ لوگ اسے ہی بہت سمجھے بیٹھے ہیں تو یہ آپ مہربانی ہے۔ فاروق بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

لو چائے آ گئی۔ شائستہ بو ل اٹھی۔

انہوں نے دیکھا ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا چلا آ رہا تھا۔

آپ لوگ تو اس طرح خاموش ہو گئے جیسے چائے آنے کے بعد بولنا منع ہو۔ فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

ہاں واقعی ...... چائے آ رہی ہے،

کوئی بھوت تو نہیں آ رہا ہے۔ محمود بولا۔

بھوت سے تو ہم ضرور ہی ڈرنے والے ہیں۔فاروق بولا۔

لو بھئی شائستہ ...... یہ تو چائے سے بھوت تک جا پہنچے۔ پروفیسر ہنسے۔

تو آپ کیا چاہتے ہیں ، ہم چائے سے کہاں تک جا پہنچیں، فاروق نے پوچھا۔

کم از کم چاند تک تو جانا ہی چاہیے۔ محمود نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

شاید تمھیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔ فاروق نے مسکرا کر کہا۔

وہ تو ہمیشہ ہی لگتی ہیں، آج کوئی نہیں بات نہیں۔ فرزانہ بول اٹھی۔

تو پھر اس کا بہترین طریقہ یہ ہے

کہ جب میں باتیں کروں ، تم اپنے کان بند کر لیا کرو۔ فاروق نے انہیں ترکیب بتائی۔ یہ ترکیب بھی ناکام رہے گی، فرزانہ نے جواب میں کہا۔ وہ کیسے؟

تمہاری آواز اتنی تیز ہے کہ کان بند کرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرف سے سنائی دے ہی جائے گی۔ محمود بولا۔

تب پھر تم اپنے کان اکھڑوا کر پھینک دو، نہ رہے گا بانس نہ رہے گی بانسری۔ فاروق نے دوسری ترکیب بتائی۔

آج کیا بات ہے، ترکیبیں بتانے میں بہت آگے جا رہے ہو، جب کہ یہ کام فرزانہ کا ہے۔ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

شاید رات میں نے فرزانہ کو خواب میں دیکھ لیا ہو گا۔ فاروق مسکرایا۔ اس کی بات پر پروفیسر داؤد ، شائستہ اور محمود کھل کھلا کر ہنس پڑے، فرزانہ کا منہ بن گیا۔

میں تو ہر وقت تمہارے سامنے موجود رہتی ہوں، خواب میں دیکھنا کوئی ضروری تو نہیں۔ اس نے جل کر کہا۔

جل بھن کر بات نہ کیا کرو، خون کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے، محمود نے گویا نصیحت کی۔

فاروق کی باتیں سننے کے بعد بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو جلنے بھننے سے محفوظ رہ سکیں۔ فرزانہ بولی۔

میں باتیں کرتا ہوں، کوئی کوئلے نہیں دہکاتا۔ فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

وہ تو ہم جانتے ہیں ، تم قلعی گر نہیں ہو؟ محمود ہنسا۔

بہت بہت شکریہ بھائی جان! فاروق شوخ لہجے میں بولا۔

بھئی کچھ چائے اور دوسری چیزوں کی طرف بھی توجہ دو۔ پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کے ساتھ انصاف کریں تو یونہی سہی، ویسے ہمارا ارادہ تھا، آج باتوں سے ہی پیٹ بھر لیں گے اور اس طرح آپ کا ناشتا بچ جائے گا فاروق نے کہا۔

یہ چیزیں تو تیار ہو چکی ہیں اگر کھائی نہ گئیں تو ضائع ہو جائیں گی، شائستہ بولی۔

بہت بہتر ...... آؤ بھئی، ذرا باتوں

میں بریک لگا کر پہلے شام کا ناشتا کر لیں۔

انھوں نے کھانے کی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ پاس رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انھوں نے چونک کر فون کی طرف دیکھا جیسے بہت بے وقت آیا...... پروفیسر داؤد نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

ہیلو! پروفیسر داؤد بول رہا ہوں۔ انھوں نے کہا۔

پھر وہ دوسری طرف کی بات سنتے رہے، ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے نظر آئے اور پھر انھوں نے جلدی سے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

میرے ایک بہت ہی گہرے دوست نے مجھے بلایا ہے، وہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہا ہے اور اس سلسلے میں

مجھ سے ملنا بہت ضروری خیال کرتا ہے، تم لوگ ناشتا کرو، میں جلد آنے کی کوشش کروں گا، لیکن ہو سکتا ہے ، مجھے دیر ہو جائے، خیر تم پریشان مت ہونا۔

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف دوڑے، محمود نے ان کے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا۔

آپ کے دوست کا نام کیا ہے؟

"پروفیسر ذاکر"۔

یہ کہتے ہوئے پروفیسر داؤد گیراج کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

☆

کیا تم پروفیسر ذاکر کے بارے میں کچھ جانتی ہو شائستہ؟ ان کے جانے کے بعد محمود نے پوچھا۔

ہاں! انکل ذاکر بھی ہمارے ملک کے بہت اچھے سائنس دان ہیں، انہوں نے ملک کے لیے بہت سی مفید چیزیں ایجاد کی ہیں، وہ اباجان کے بہت گہرے دوست ہیں اور وہ اکثر ان سے ملنے کے لیے جاتے رہتے ہیں، انکل ذاکر بھی ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں، کئی بار میں ان کے ہاں جا چکی ہوں۔ تم اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ شائستہ رکے بغیر کہتی چلی گئی۔

ان کے بارے میں سب کچھ بتا دو ، وہ کہاں رہتے ہیں، ان کی تجربہ گاہ کہاں ہے ان کے ساتھ اور کون

کون رہتا ہے۔محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

لو فرزانہ ...... محمود پر تو سوار ہو گیا بھوت جاسوسی کا۔ فاروق نے منہ بنایا۔

تو لوں کیا ...... اس میں کچھ لینے اور دینے کی گنجائش کہاں ہے۔ فرزانہ مسکرائی۔

شائستہ تم جلدی بتاؤ، ان دونوں کو تو وقت ضائع کرنے کی عادت ہے۔ محمود نے جھنجھلا کر کہا۔

وہ گرین ٹاؤن کے آخر میں رہتے ہیں، وہاں آبادی بہت کم ہے، ان کی تجربہ گاہ اور رسد گاہ بھی وہیں ...... ان کے ساتھ ان کا ایک لڑکا عاطف اور دو ملازم صابر اور کریم رہتے ہیں۔ ان کے اسسٹنٹ کا نام ریاض شاہد ہے

جو صبح سے شام تک ان کے ساتھ رہتا ہے،البتہ رات کو اپنے گھر چلا جاتا ہے، ان کے دو تین اسسٹنٹ اور بھی ہیں، ان کے نام مجھے معلوم نہیں، خاص اسسٹنٹ ریاض شاہد ہی ہے۔

یہ بھی بتا دو، کس عمر کے آدمی ہیں، شکل صورت کیسی ہے۔ محمود نے جلدی سے پوچھا۔

"تقریباً بوڑھے ...... ڈیڈی کی عمر کے ...... ان کے سر پر ایک بھی بال نہیں، چہرے پر بڑی سی سفید داڑھی ہے، آنکھیں نیلے رنگ کی اور بڑی بڑی ہیں ، قد لمبا اور جسم پتلا دبلا۔ شائستہ بتاتی چلی گئی۔

بہت خوب! اور اب ہم پروفیسر ذاکر کے ہاں چلیں گے۔" محمود نے کہا۔

یہ کیا بات ہوئی ، بھلا ہمیں وہاں

جانے کی کیا ضرورت ہے۔ فاروق نے تلملا کر کہا۔

وہ پریشان ہیں اور انہوں نے انکل کو بلایا ہے، اس طرح انکل بھی پریشان ہو سکتے ہیں، ہم یہ دیکھیں گے کہ ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ محمود نے کہا۔

ہو سکتا ہے، وہ کسی ایجاد کے سلسلے میں پریشان ہوں، فارمولا فٹ نہ بیٹھ رہا ہو، اس میں کوئی کسر رہ گئی ہو ...... ان حالات میں بھلا ہم کیا کر سکیں گے۔

پھر بھی ہمیں چل کر معلوم تو کرنا چاہیے۔ محمود نے کہا۔

تم ہی جا کر معلوم کر لو، میں اور فرزانہ تو شائستہ سے باتیں کریں گے۔

تم اپنے ساتھ فرزانہ کو نہیں گھسیٹ سکتے۔ محمود بھنا اٹھا۔

ارے ارے ...... میں کب اس بے چاری کو گھسیٹ رہا ہوں، یہ تو آرام سے کرسی پر بیٹھی ہے۔ فاروق بوکھلا کر بولا۔

مذاق نہ کرو، ابھی فرزانہ نے اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا، ہو سکتا ہے وہ میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو۔ محمود بولا۔

اچھی بات ہے تو پھر فرزانہ کی مرضی معلوم کر لیتے ہیں، ہاں تو فرزانہ تم کیا کہتی ہو، محمود کے ساتھ پروفیسر ذاکر کے ہاں جاؤ گی یا یہیں بیٹھ کر مزے مزے کی باتیں کرو گی۔ فاروق نے پوچھا۔

میں سوچ رہی ہوں کہ کس کا

ساتھ دوں ...... اگر پروفیسر ذاکر پریشان ہیں تو اس کا مطلب ہے ، پروفیسر انکل بھی پریشان ہوں گے اور ان کی پریشانی دور کرنے کے لیے ہم کچھ کر سکتے ہیں تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری اس حرکت کو پروفیسر انکل پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں اور ہم سے ناراض ہو جائیں۔ فرزانہ کہتی چلی گئی۔

ناراض تو خیر وہ نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ بات اچھی طر جانتے ہیں کہ ہم انہیں پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ محمود نے جواب دیا۔

ہاں! یہ بات بھی ہے، خیر تو پھر میں ایک تجویز پیش کرتی ہوں۔ فرزانہ بولی۔

یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ فاروق نے جل کر کہا۔

سنو! ہم وہاں جا کر تجربہ گاہ اور رہائشی حصے کا خاموشی سے جائزہ لیں گے ، اگر حالات پرسکون ہوئے تو واپس آ جائیں گے ، ورنہ کچھ کریں گے۔

بہت خوب ...... شکریہ فرزانہ ...... تم بہت عقل مند ہو۔ ہاں تو فاروق تم کیا کہتے ہو۔

میں اگر چہ بہت عقل مند نہیں ہوں۔ تاہم اس موقعے پر پیچھے رہنا پسند نہیں کروں گا...... چلو چلیں۔ فاروق نے مسمی صورت بنا کر کہا اور شائستہ مسکرا دی۔

انھوں نے شائستہ سے پروفیسر ذاکر کا پورا پتا معلوم کیا، اس سے اجازت لی اور کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ

گئے۔

گرین ٹاؤن بہت دور تھا اور وہ ٹیکسی کے بغیر نہیں جا سکتے تھے، خوش قسمتی سے بہت جلد انہیں ایک ٹیکسی مل گئی اور وہ روانہ ہو گئے۔ جس وقت گرین ٹاؤن میں داخل ہوئے، سورج غروب ہو رہا تھا اور یہ شدید سردی کے دن تھے، لوگ شام ہی سے گھروں میں دبک گئے تھے اور گرین ٹاؤن تو یوں بھی بہت کم آباد علاقہ تھا اور پھر پروفیسر ذاکر کی کوٹھی تو بالکل ہی آخری سرے پر واقع تھی، چنانچہ جب ان کی ٹیکسی کوٹھی کے سامنے رکی تو چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا، یوں لگتا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو، حالانکہ ابھی صرف مغرب کا وقت ہو اتھا اور لوگ مسجدوں میں مغرب کی نماز ادا

کر رہے تھے۔

گرین ٹاؤن آنے کے چکر میں آج ہم مغرب کی نماز ادا نہیں کر سکے۔ فاروق نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

ہاں! اور یہاں دور دور تک کوئی مسجد بھی نظر نہیں آ رہی۔

خیر ...... آؤ شاید ہم پروفیسر ذاکر کے گھر میں ادا کر سکیں۔ یہ کہہ کر محمود آگے بڑھا اور پھر ٹھٹھک کر رُک گیا اندر صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی ، باقی حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

کیا بات ہے، تم رک کیوں گئے۔

مجھے عجیب سا احساس ہوا ہے۔

اور وہ احساس کیا ہے؟ فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

یوں لگتا ہے جیسے کوٹھی میں کوئی

بھی شخص موجود نہ ہو۔ اس نے کہا، چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم سے پہلے ہی تو پروفیسر انکل یہاں کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ فاروق بولا۔

لیکن پورچ میں ان کی کار نظر نہیں آ رہی۔اب کہو کیا کہتے ہو۔ یہ کہہ محمود فاروق کو گھورنے لگا۔

اب میں کیا کہوں، سب کچھ تو تم کہہ چکے ہو۔ فاروق نے منہ بنایا۔

اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ ہم کوٹھی کے اندر داخل ہو جائیں۔ محمود بولا۔

راستے تو کئی ہیں، ہم چپ چاپ واپس جا سکتے ہیں اور سب سے پہلے یہ معلوم کریں گے کہ پروفیسر انکل واپس گھر تو نہیں پہنچ چکے، اگر نہیں تو ہم

ابا جان کو فون کر سکتے ہیں، پھر وہ یہاں پہنچ کر خود ہی حالات کا جائزہ لے لیں گے اور اس طرح ہم اس معاملے سے صاف الگ ہو جائیں گے۔ فاروق نے کہا۔

تم تو ہر معاملے سے ہی الگ رہنے کی سوچا کرو، جب کہ یہ معاملہ مجھے حد درجے پراسرار لگ رہا ہے۔ محمود تلملا کر بولا۔ یہ مجھے حد درجے پراسرار لگنے والے معاملے ذرا پسند نہیں۔ فاروق نے منہ بنایا۔

تو تم یہیں ٹھہرو، میں اور فرزانہ اندر سے ہو آتے ہیں۔ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا، یہ حضرات ساتھ ہوں گے، تب بھی وقت ضائع کریں گے۔ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

گویا میں صرف وقت ضائع کرتا ہوں

اور تم صرف وقت سنوارتے ہو، جاؤ سنوارو جا کر۔ فاروق نے بھی جھنجھلا کر کہا۔

اور وہ دونوں کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے۔ فاروق انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کی، اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ پھر جونہی وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے ، وہ تیزی سے کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف بڑھا۔

☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کتا روتا ہے

گیٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ روش پر چلتے ہوئے صدر دروازے پر پہنچے۔ محمود نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی، دور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی ، ساتھ ہی کسی کتے کے رونے کی آواز ابھرنے لگی، کتا بہت خوفناک آواز میں رو رہا تھا، ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

فرزانہ اندر تو کتا بھی ہے۔ محمود نے جلدی سے کہا۔

تو کیا ہوا؟ فرزانہ لاپروائی سے بولی۔

کہیں وہ ہم پر جھپٹ نہ پڑے۔ محمود بولا۔

سوال تو یہ ہے کہ وہ رو کیوں رہا ہے، پروفیسر ذاکر اندر کس حال میں

ہیں اور پروفیسر انکل کہاں چلے گئے۔ فرزانہ کہتی چلی گئی۔

میں ان سوالات کے جوابات نہیں دے سکتا، کیونکہ کوئی نجومی نہیں ہوں، ہاں اندر چل کر حالات دیکھ کر ضرور جواب دے سکوں گا۔ محمود نے کہا۔

فاروق کے انداز میں باتیں نہ کرو۔ فرزانہ جھلا گئی۔

نہیں تو ...... یہ تو میرا اپنا انداز ہے۔ محمود نے جلدی سے کہا۔

اچھا ہو گا ، اب بور نہ کرو، نہ جانے یہ دروازہ کب کھلے گا۔ فرزانہ نے برا سا منہ بنایا۔

جب خدا کو منظور ہو گا، کھل جائے گا۔ محمود نے ٹھنڈی سانس بھری۔

شاید فاروق اسی خیال کے پیش نظر ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ فرزانہ نے کسی

خیال کے آنے پر کہا۔

کیا مطلب ، بھلا وہ کیوں نہیں آیا۔

اس نے سوچا ہو گا۔ ہم دروازے پر کھڑے جھک مارتے رہ جائیں گے اور وہ پچھلی طرف سے کسی پائپ کے راستے داخل ہو جائے گا۔

اوہ! چلو خیر ...... یہ اور بھی اچھا ہے ، ہو آ کر دروازہ کھول دے گا۔ محمود نے خوش ہو کر کہا۔

یہ ضروری نہیں، وہ ہماری بے لبی پر مسکراتا ہوا پہلے اندر کا جائزہ لے گا اور پھر دروازہ کھولنے آئے گا، اس وقت تک شاید ہم بوڑھے ہو جائیں۔ فرزانہ نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے کہا۔

لیکن ابھی تو ہم جوان بھی نہیں

ہوئے، یک دم بوڑھے کس طرح ہو جائیں گے۔ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

پھر تم نے فاروق کے انداز میں بات کی۔

آخر آج تم فاروق کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو، اس نے کیا کیا ہے ؟ محمود جھلا کر بولا۔

میں نہیں، تم اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو اور اس کے بھی، کیا میں دوبارہ گھنٹی بجاؤں۔ محمود نے تنگ آ کر کہا۔

ہاں! ضرور بجاؤ ...... لیکن میں جانتی ہوں ، کچھ نہیں ہو گا، تمہارا خیال درست تھا۔

کون سا خیال؟

یہ کہ اندر کوئی نہیں ہے اور اب میں شرط لگا سکتی ہوں کہ اندر واقعی کوئی شخص موجود نہیں ہے۔

تو کیا کوٹھی خالی پڑی ہے۔

بالکل یہی بات ہے۔ اس نے کہا۔

سوال یہ کہ ان حالات میں ہم کیا کریں۔

ہم اندر جائیں گے ، دروازے کو دھکیل کر دیکھو، کسی کھڑکی کو آزماؤ، کہیں فاروق اندر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ فرزانہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اچھی بات ہے۔

یہ کہہ کر محمود نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور پھر چونک کر بولا۔

ارے! دروازہ تو کھلا ہے۔

کھلا ہے تو پھر بسم اللہ کرو۔

فرزانہ جلدی سے بولی۔ بسم اللہ!

محمود نے کہا اور اندر داخل ہو گیا، فرزانہ اس کے پیچھے تھی، دروازے کے بعد ایک تنگ سی راہداری تھی، جس میں دو آدمی مشکل سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ راہداری کے دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے، سب کمرے تاریک پڑے تھے، راہداری کے آخری سرے پر دائیں ہاتھ ایک کمرے کے شیشے روشن تھے اور راہداری کے اس سرے کے بعد بائیں ہاتھ چھت پر جانے کے لیے زینہ تھا۔ وہ روشن کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ پہلے دروازے میں کوئی جھری تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن اس شاندار کوٹھی کے دروازے میں جھری کہاں ہوتی، دائیں بائیں کھڑکیاں ضرور تھیں اور ان

میں انہیں شیشے بھی نظر آئے، لیکن جب انہوں نے شیشوں میں سے جھانکنا چاہا تو انہیں معلو ہوا، وہ ایسے شیشے تھے، جن میں سے اندر تو دیکھا جا سکتا تھا، باہر نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آخر کمرے کے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ محمود نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

دونوں نے اندر قدم رکھے اور پھر ساکت رہ گئے، پاؤں فرق پر اس طرح جم کر رہ گئے جیسے اب زندگی بھر کبھی نہ اٹھیں گے۔

☆

فاروق نے کوٹھی کے پیچھے پہنچ کر دیوار پر نظر ڈالی، ایک پائپ چھت تک جا رہا تھا، اس کا چہرہ کھل اٹھا، جوتے اتار کر اس نے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے اور پائپ پر چڑھنے لگا۔ پائپ برف کی طرح سرف تھا اور اس کے ہاتھوں کو شل کیے دے رہا تھا، جلد ہی اسے یوں لگنے لگا جیسے اس کے ہاتھ بھی برف کے بن گئے ہوں، لیکن وہ بھی فاروق تھا، ہمت ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ آخر منڈیر تک پہنچ ہی گیا۔پہلے اس نے ایک ہاتھ پائپ سے ہٹا کر منڈیر پر جمایا اور پھر دوسرا، دونوں ہاتھوں پر اوپر اٹھتے ہوئے اس نے اپنا آدھا دھڑ منڈیر پر ڈال دیا اور ہانپنے لگا ، اگر سردی اس غضب کی نہ

پڑ رہی ہوتی تو اس پائپ پر چڑھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چند لمحے تک سانس لینے کے بعد وہ چھت پر اتر گیا۔ یہاں بھی ہر طرف تاریکی تھی۔ اس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی چھت پر ڈالی، پوری چھت صاف تھی، البتہ اس کے اوپر ایک اور لوہے کا زینہ بنا تھا جو ایک گنبد نما عمارت تک جا رہا تھا، وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور پروفیسر ذاکر کی تجربہ گاہ ہے، تجربہ گاہ تاریک تھی، لیکن اچانک اس نے تجربہ گاہ کے اندر روشنی کی ایک کرن چمکتی دیکھی اور وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ روشنی کی کرن فوراً ہی غائب ہو گئی۔ اس کی نظریں تجربہ گاہ کے شیشوں پر جم کر رہ گئیں، چند لمحوں کے بعد ایک بار پھر روشنی جھلکی،

اب تو اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، اس نے سوچا، تجربہ گاہ کے اندر ضرور آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے، کیوں نہ میں بھی اس کھیل میں شریک ہو جاؤں، یہ سوچ کر وہ نیچے کے جانے کے خیال کو دل سے نکال کر تجربہ گاہ تک جانے والے زینے کی طرف بڑھا، وہ بھول گیا کہ محمود اور فرزانہ کو نیچے چھوڑ آیا ہے اور نہ جانے ان پر کیا بیت رہی ہو، اس وقت تو اسے صرف اور صرف تجربہ گاہ میں نظر آنے والی روشنی یاد رہ گئی تھی۔

لوہے کے زینے پر چڑھتے ہوئے اس کا دل دھ دھک کر رہا تھا ، کیونکہ حالات انتہائی عجیب و غریب تھے، وہ تو پروفیسر داؤد کے پاس بیٹھے تھے کہ ان کے دوست پروفیسر ذاکر کا فون آ گیا،

وہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ سوال تو یہ تھا کہ کیا پروفیسر داؤد جیسے پتلے دبلے آدمی ان کی حفاظت کر سکتے تھے، آخر انہوں نے پروفیسر داؤد کو ہی کیوں بلایا تھا، اگر کوئی خطرہ ہی محسوس کر رہے تھے تو پولیس کو بلانا چاہیے تھا اور کوٹھی کے حالات دیکھنے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ان کا یہ خیال بالکل ٹھیک تھا کہ وہ خطرے میں ہیں، لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ یہاں پروفیسر داؤد کے آنے کے کوئی آثار نہیں پائے گئے تھے، ان کی کار باہر موجود نہیں تھی، یوں لگتا تھا جیسے وہ یہاں تک پہنچے ہی نہیں تھے ، تو پھر وہ کہاں چلے گئے، ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اب یہاں تجربہ گاہ میں کیا ہو رہا

تھا۔

اس قسم کے اور نہ جانے کتنے سوال فاروق کے ذہن میں ابھرتے رہے اور وہ لوہے کا ٹھنڈا زینہ چڑھتا رہا، یہاں تک کہ تجربہ گاہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ کافی بڑا تھا اور فاروق نے محسوس کیا، مضبوط بھی بہت ہو گا، اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا اور اس کا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اندر کوئی ہے وہ کون ہے اور اندھیرے میں کیا کر رہا ہے۔ یہ فاروق کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا، شاید اندر موجود شخص بھی پنسل ٹارچ سے کام لے رہا تھا، فاروق نے سوچا، مجھے تجربہ گاہ کا بھی ایک چکر لگانا چاہیے۔ شاید اندر داخل ہونے

کی کوئی صورت نظر آجائے۔ اس نے چکر لگایا، اور پھر مایوس ہو کر دوبارہ دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا، کیونکہ گنبد نما اس عماعت میں کھڑکیاں ضرور موجود تھیں، لیکن سب کی سب اندر سے بند تھیں اور اندھے شیشوں والی تھیں، لوہے کی ایک سیڑھی اوپر گنبد تک ضرور جا رہی تھی ، لیکن ظاہر ہے کہ اگر گنبد کے اوپر والے حصے میں کوئی دروازہ یا سوراخ بھی ہوتا تو فاروق اس میں سے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا، وہ کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، اچانک اس نے سوچا ، میں گنبد کے اوپر سے بے شک چھلانگ نہیں لگا سکتا، لیکن اندر جھانک تو سکتا ہوں، اس خیال کے آتے ہی وہ زینہ چڑھنے لگا، یہاں تک کہ گنبد

کی چوٹی پر پہنچ گیا، گنبد شیشے کا بنا ہوا تھا اور اس میں کوئی دروازہ یا سوراخ نہیں تھا، فاروق کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی، اچانک اس نے ایک بار پھر اندر روشنی کی کرن دیکھی اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک سیاہ پوش بھی نظر آیا، وہ ایک الماری کے پٹ کھولے کھڑا تھا۔ اتنے میں روشنی غائب ہو گئی، شاید وہ ہر چیز پر صرف ایک آدھ لمحے کے لیے روشنی ڈال رہا تھا، گویا کسی خاص چیز کی تلاش میں تھا، فاروق نے سوچا، اب اس کا گنبد پر جمے رہنا بے فائدہ ہے، نیچے چل کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ نیچے اترنے لگا، ابھی نچلی سیڑھیوں پر نہیں پہنچا تھا کہ گنبد نما عمارت کا دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی،

وہ جلدی سے سیڑھیوں پر نہیں پہنچا تھا کہ گنبد نما عمارت کا دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی ، وہ جلدی سے سیڑھیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔

سایہ نیچے جانے کے لیے چھت کی طرف جا رہا تھا۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہولناک منظر

پروفیسر داؤد کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی، شائستہ چونک اٹھی اور تقریباً دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچی۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ کے جانے کے بعد وہ بہت پریشان ہو گئی تھی، اس نے دروازہ کھولا اور اپنے ڈیڈی کو سامنے دیکھ کر سکون کا سانس لیا، لیکن اس کا سکون فوراً ہی رخصت ہو گیا، پروفیسر داؤد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کے سر پر ان کا ہیٹ بھی نہیں تھا۔

ابو! آپ کا ہیٹ کہاں ہے۔

اوہ ہیٹ! انہوں نے جلدی سے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بولے۔

وہ ...... وہ شاید پروفیسر ذاکر کے ہاں رہ گیا۔

لیکن بات کیا، آپ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ شائستہ نے پریشان ہو کر کہا۔

اندر چلو بیٹی ...... جلدی کرو، میں محمود ، فاروق اور فرزانہ کے سامنے بتانا پسند کروں گا۔

لیکن وہ تو اندر نہیں ہیں۔ شائستہ بوکھلا اٹھی۔

کیوں! کیا واپس چلے گئے۔ پروفیسر داؤد اندر داخل ہوتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولے۔

جی نہیں، آپ نے بتایا تھا کہ پروفیسر ذاکر خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہیں آپ کے چلے جانے کے بعد انہوں نے بھی پروفیسر ذاکر کے ہاں پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیا وہ آپ کو راستے میں کہیں نظر نہیں آئے۔

میں آتے ہوئے ایک اور راستے سے آیا ہوں اور اس کی خاص وجہ تھی، لیکن اب کیا ہو گا، کاش وہ وہاں نہ جاتے۔ ان کا یہاں ٹھہرنا ضروری تھا۔ پروفیسر داؤد حددرجے پریشان اور بے چین نظر آ رہے تھے، ان کے جسم پر کپکپی سی سوار تھی۔

آخر بات کیا ہے، آپ بتا کیوں نہیں دیتے، اگر کوئی ایسی ہی خطر ناک بات ہے تو انکل جمشید کو فون کر دیں۔

ہاں! میں یہی کروں گا، پروفیسر ذاکر کے ساتھ ساتھ محمود ، فاروق اور فرزانہ بھی سخت خطرے میں گھر گئے ہیں۔

اف خدا...... آخر یہ کیا معاملہ ہے۔

ٹھہرو ...... پہلے مجھے فون کر لینے دو، پھر بتاؤں گا اور ہاں ...... تم جلدی

سے سب دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر لو۔ انہوں نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

اچھا۔ اللہ رحم کرے۔

یہ کہہ کر شائستہ دوڑتی ہوئی چلی گئی اور پروفیسر داؤد فون پر جھک گئے اور انہوں نے انسپکٹر جمشید کے گھر کے نمبر ڈائل کیے، سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔ دوسری طرف بیگم جمشید تھیں۔

یہ میں ہوں، داؤد ...... فون جلدی سے جمشید کو دو۔

خیر تو ہے۔

دیر نہ کرو۔ انہوں نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ دوسری طرف سے ریسیور میز پر رکھنے کی آواز آئی، پھر انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی۔

ہیلو پروفیسر صاحب ...... میں جانتا

ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ...... یہی نا کہ محمود ، فاروق اور فرزانہ آج واپس نہیں آئیں گے، انہیں آپ نے روک لیا ہے۔

یہ بات نہیں ...... سنو جمشید ...... ان کی زندگی خطرے میں ہے، وہ اس وقت پروفیسر ذاکر کے گھر میں ملیں گے۔ ان کی زندگی بچانے کے فوراً روانہ ہو جاؤ۔

وہ وہاں کس طرح پہنچ گئے۔ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

یہ تو بعد میں بھی معلوم کر سکتے ہو۔ پروفیسر جھلا کر بولے۔

اچھی بات ہے۔ ان کی آواز سنائی دی اور پروفیسر ریسیور رکھ کر دروازے کی طرف مڑے، جس میں سے شائستہ اندر آ رہی تھی۔

میں نے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی ہیں۔

شاباش بیٹی! اب میں تمہیں ساری بات بتاؤں گا ، لیکن پہلے میں ایک کام کر آؤں۔

یہ کہہ کر وہ دوڑتے ہوئے اوپر اپنی تجربہ گاہ میں چلے گئے، تھوڑی دیر بعد ان کی واپسی ہوئی، شائستہ کے چہرے پر شدید الجھنیں صاف نظر آ رہی تھی۔

سنو بیٹی ...... میں پروفیسر ذاکر کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو ......

پروفیسر داؤد کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، دروازے کی گھنٹی بجی تھی، دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر صدر دروازے کی طرف چل پڑے، اسی وقت گھنٹی ایک بات پھر

بج اٹھی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

☆

کمرے کا منظر حد درجے ہولناک تھا، یوں تو آئے دن انہیں خوفناک اور خطرناک مناظر دیکھنے پڑتے تھے، لیکن اس وقت جو نظارہ ان کے سامنے تھا، شاید انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، کمرے کے چکنے نیلے رنگ کے فرش پر ایک لاش پڑی تھی، اس کے سینے میں خنجر دستے تک دھنسا ہوا تھا ...... دونوں ہاتھ بالکل سیدھے پھیلے ہوئے تھے اور اس کے اردگرد خون دور تک پھیل گیا تھا، اس خون میں ایک کتا لاش کے سرہانے بیٹھا تھا، اس کا منہ خون سے تر تھا، شاید اس نے بار بار اپنا چہرہ فرش پر پھیلے خون پر پھیرا تھا، کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر ایک عجیب پراسرار اور خوفناک سی آواز میں رونے لگتا، اس

کی آواز انہیں کسی روح کی آواز محسوس ہو رہی تھی، لاش کے سر کے پاس ہی ایک سیاہ رنگ کا ہیٹ پڑا تھا جس کا نچلا حصہ خون میں لتھڑ گیا تھا۔

اچانک کتے کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی ، اس نے انہیں چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے حسرت اور غم ٹپک رہا تھا، انہیں یوں لگا جیسے کتا ان سے کہہ رہا ہو ...... آ جاؤ تم بھی لاش کے سرہانے بیٹھ کر رو لو۔

دونوں دو قدم آگے بڑھے ، انہیں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں کتا ان پر جھپٹ نہ پڑے۔ نزدیک ہونے پر انہوں نے دیکھا ، کتا زنجیر سے بندھا تھا اور زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ایک

ہک میں بندھا ہوا تھا، وہ سمجھ گئے، کتا اپنے مالک کی مدد اس لیے نہ کر سکا کہ وہ بندھا ہوا تھا۔ دونوں ابھی گم صم کھڑے ہی تھے کہ اچانک انہوں نے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنی، وہ فوراً دروازے کے ساتھ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے سر سے پیر تک ایک سیاہ لباس والے کو اندر داخل ہوتے دیکھا، اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا، اچانک اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا او ر اس سے پہلے کہ محمود اور فرزانہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ، وہ تیزی سے مڑا اور اس کی نظریں ان دونوں پر جم گئیں۔

کون ہو تم!

ہم ...... ہم کون ہیں ...... فرزانہ تم

اسے بتا دو، ہم کون ہیں۔

محمود نے ہکلا کر کہا۔

میں کیوں بتاؤں کہ ہم انکل ذاکر سے ملنے آئے ہیں ...... لیکن یہ انہیں کیا ہو گیا ہے ، یہ اپنے اردگرد رنگ پھیلائے کیوں لیٹے ہیں۔ فرزانہ بولی۔

پتا نہیں ، ان بھائی صاحب کو معلوم ہوگا۔ محمود نے مسمی صورت بنا کر کہا۔

اور گھر کے باقی لوگ بھی نظر نہیں آ رہے ،آخر یہ کیا معاملہ ہے جناب؟ فرزانہ نے پوچھا۔

پہلے تم بتاؤ ...... کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ اس نے غرا کر پوچھا۔

ہم بچے ہیں اور اسی شہر سے آئے ہیں۔ محمود نے کہا۔

یہ کیا جواب ہوا؟ اس نے بھنا کر

کہا۔

اگر تمہیں یہ جواب پسند نہیں آیا تو ہم دوسری طرح جواب دے دیتے ہیں، میں محمود ہوں اور یہ فرزانہ ...... ہم انکل ذاکر سے ملنے آئے تھے۔ یہ ہمارے انکل کے دوست ہیں، کیا انہیں آپ نے مارا ہے۔ محمود نے اپنی نظریں اس پر جما دیں۔ لیکن وہاں تو نقاب چڑھا ہوا تھا۔

ہاں! میں نے ہی اسے ختم کیا ، گھر کے باقی لوگ اور ملازم ایک کمرے میں بند پڑے ہیں اور اب تمہیں بھی اسی کمرے میں بند کرنا پڑے گا۔

کیوں! ہم نے کیا قصور کیا ہے۔

قصور تو پروفیسر ذاکر اور اس کے گھر والوں نے بھی کوئی نہیں کیا تھا مگر ...... ہم تمہیں اس کمرے میں بند

کرنے نہ گئے تو تم کمرے کا دروازہ کھول دو گے اور ان لوگوں کو ہوش میں لے آؤ گے ، پھر پولیس کو فون کر دیا جائے گا جب کہ ہم چاہتے ہیں ، صبح تک پولیس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو۔ وہ کہتا چلا گیا۔

آپ ہمیں کمرے میں بند نہ کریں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پولیس کو ضرور اطلاع دے دیں گے، لیکن اس کے فرشتوں کو ہرگز اطلاع نہیں دیں گے۔ محمود نے بوکھلا کر کہا۔

بکو مت...... اور چپ چاپ کھڑے رہو۔

بہت اچھا ...... لیکن بھائی جان صاحب ...... یہ آپ نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، آپ کا چہرہ کہاں گیا۔ محمود بول اٹھا۔

تم عجیب لڑکے ہو؟ سیاہ پوش نے اسے گھورا۔

ہاں! یہ بات مجھ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے کی ہے محمود نے کہا۔

دماغ نہ چاٹو اور خاموش کھڑے رہو، ورنہ تم دونوں بھی پروفیسر کے ساتھ لیٹے نظر آؤ گے۔

ارے باپ رے! فرزانہ نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا، پھر محمود کی طرف مڑی۔

میرا خیال ہے، تم انکل پروفیسر کے ساتھ لیٹنا پسند نہیں کرو گے۔

فرش کی حالت دیکھ رہی ہو، بھلا ان حالات میں ہم کیسے لیٹ سکتے ہیں۔ محمود نے کہا۔

تو بس پھر ...... اب نہ بولنا ......

ورنہ یہ ہمیں وہاں لٹا دیں گے۔فرزانہ نے گویا نصیحت کی۔

بہت اچھا! اب میں ہرگز نہیں بولوں گا، تمہارا مشورہ بہت نیک ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بھی خاموش ہی رہو گی۔

اور کیا ......جب انہیں ہمارا بولنا پسند ہی نہیں تو ہم کیوں بولیں۔ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

ٹھیک ہے لیکن ...... محمود کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظریں کمرے میں موجود ایک چیز پر جم گئی تھیں۔

یہ تم خاموش ہوئے ہو۔ سیاہ پوش نے چلا کر کہا۔

گلا پھاڑ کر نہ بولو بھائی ......میرے کان کے پردے بہت کمزور ہیں۔

تم یوں نہیں مانو گے ...... ٹھہرو

...... بتاتا ہوں تمھیں ! اس نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ذرا اچھی طرح بتانا ...... ورنہ یہ ماننے والے نہیں۔ کمرے کے دروازے میں سے آواز آئی۔ اور سیاہ پوش بوکھلا اٹھا۔

اس نے دیکھا، دروازے میں ایک اور لڑکا کھڑا تھا۔

یک نہ شد تین شد۔ اس کے منہ سے نکلا۔

شکر کرو ...... یہاں تین ہی موجود ہیں، اگرچوتھے صاحب بھی یہاں آ گئے ہوتے تو اس وقت سر پکڑ کر رو رہے ہوتے۔ فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب؟ اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

میں مطلب بتانے میں بہت نالائق

ہوں، تمہیں غلط سلط مطلب بتا بیٹھوں گا اور پھر تم مارنے کے لیے جھپٹ پڑو گے، ایسے میں اگر مجھے غصے آ گیا تو حالات نازک صورت اختیار کر لیں گے۔ فاروق شوخ لہجے میں بولا۔

یہ کیا بکواس ہے، آخر تم لوگ ہو کون؟

ہم ...... تم ہمیں اپنی شامت بھی خیال کر سکتے ہو۔

محمود نے کہا۔

اب تمہیں سبق دینا ہی پڑے گا۔

میں نے غرا کر کہا۔

کیا تمہیں الجبرا آتا ہے، ہماری بہن الجبرے میں کمزور ہے اسے الجبرے کا سبق دے دو۔

اور انہیں جغرافیے کا۔ فرزانہ نے لقمہ دیا۔

اوہو...... میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس نے چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

بڑی خوشی سے ہو جاؤ، ہمیں کون اعتراض نہیں ہو گا ...... اس سے پہلے بھی کچھ لوگ ہماری باتیں سن سن کر پاگل ہو چکے ہیں، اگر تم بھی ہو گئے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہو گی۔فاروق نے کہا۔

دراصل تینوں وقت گزارنے کے چکر میں تھے، یہی وجہ تھی کہ اسے باتوں میں لگا بیٹھے تھے اور پھر اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا جب کہ اس وقت تینوں نہتے تھے۔ ان کے پاس کوئی کھلونا ہتھیار نہیں تھا، وہ تو پروفیسر داؤد کی دعوت پر ان کے گھر میں پہنچے ہوئے تھے، ایسے میں ہتھیار گھر سے لے کر چلنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اس

وقت وہ کمرے میں ایسی جگہ کھڑے تھے۔ جہاں سے اس پر حملہ کرنا آسان نہیں تھا ہاں اس کے ہاتھ میں پستول نہ ہوتا تو اور بات تھی۔

اچانک انہوں نے قدموں کی آواز سنی، تینوں چونک اٹھے لیکن سیاہ پوش نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔ جلد ہی تین نقاب پوش اور اندر داخل ہوئے، ان کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے۔ یہ دیکھ کر محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں، برے پھنسے، پہلے تو صرف ایک پستول والے سے واسطہ تھا۔ اب یہ چار ہو گئے ہیں۔

ارے یہ کون ہیں؟ آنے والوں میں سے ایک نے حیران ہو کر پوچھا۔

پتا نہیں ...... ہوں گے پروفیسر ذاکر

کے پڑوسی۔ کیا باہر کا دروازہ کھلا تھا جو یہ اندر داخل ہو گئے۔ پہلے نے پوچھا۔

دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز ہم نے سنی تھی اور یہی سمجھے تھے کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا۔ لہذا جو کوئی بھی ہے، گھنٹی بجا بجا کر واپس چلا جائے گا۔ ہم تو دراصل تجربہ گاہ میں مصروف تھے اور تم رسد گاہ میں ...... ایسے میں دروازے پر آ کر کیسے دیکھتے۔ ایک نے کہا۔

ٹھیک ہے ، لیکن سوال یہ ہے کہ دروازہ کھلا ہوا کیوں تھا۔ ہمیں وہ چیز بھی کہیں نہیں ملی۔ ہم نے ایک ایک انچ کی تلاشی لے ڈالی ہے۔

یہ چیز مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے ، آخر دروازہ کھلا ہوا کیوں تھا، کیا

پروفیسر ذاکر کوٹھی کا دروازہ اندر سے بند نہیں رکھتے تھے۔

بالکل بند رکھتے تھے۔ پہلا نقاب پوش بولا۔

تو پھر ...... کہیں ایسا تو نہیں۔

اچانک وہ کچھ کہتے رک گیا ...... اس نے چونک کر کہا۔

اوہ میں سمجھ گیا، ہم اب بھی کامیابی سے زیادہ دور نہیں ہیں، لیکن پہلے ان تینوں کو کمرے میں بند کر دینا چاہیے۔۔

آخر تمہارے ذہن میں کیا بات آئی ہے۔ دوسرے نے کہا پریشان ہو کر کہا۔

بات میرے ذہن میں بعد میں آئی ہے، اس سے پہلے مجھے اس کمرے میں ایک چیز نظر آئی ہے، جس سے میں

ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں ...... جلدی کرو، ان تینوں کو بھی اسی کمرے میں یا کسی اور کمرے میں بند کر آؤ۔ پہلے نے کہا۔

اچھی بات ہے۔ یہ کہہ کر بعد میں آنے والے تینوں سیاہ پوش ان کی طرف بڑھے۔

نہیں نہیں ...... ہمیں کمرے میں بند نہ کرو، ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ فاروق نے تھرتھر کانپتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ محمود اور فرزانہ نے بھی تھرتھرانا شروع کر دیا۔ انہیں اس طرح کانپتے دیکھ کر ان تینوں کے چہرے پر وحشیانہ مسکراہٹیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے اپنے پستول جیب میں رکھ لیے ، یہ دیکھ کر پہلے نے بھی یہ کیا۔

یہ ...... یہ تم نے پستول جیب میں

کیوں رکھ لیے۔ محمود نے بوکھلا کر کہا۔

اس لیے کہ ہمیں تم جیسے چوہوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ پھلا ہنسا۔

ہائیں ...... ہم تمھیں چوہے نظر آتے ہیں ، تمھاری نظریں کمزور تو نہیں ہیں۔ فرزانہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

تمھیں اپنی آنکھوں کا فوراً علاج کرانا چاہیے۔

بکو مت۔

اب وہ تینوں ان کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے، اس وقت حرکت میں آنا بہت ضروری تھا، ورنہ پھر انہیں مہلت نہ ملتی...... تینوں نے جھکائی دی اور دوسری طرف نکلتے چلے گئے۔ البتہ انہوں نے اتنا خیال ضرور رکھا کہ خون پر پیر نہ پڑنے پائے۔ چاروں سیاہ پوشوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ پہلا گرجا اور اس کے تینوں ساتھی تین مختلف سمتوں سے ان کی طرف جھپٹے، جونہی وہ ان کے نزدیک آئے، فاروق زور سے اوپر اچھلا اور اس کا سر اپنی طرف آتے ہوئے حملہ آور کی ناک سے ٹکرایا، اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ محمود تیزی سے جھکا ...... اور آتے ہوئے دشمن کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں، وہ دھڑام سے چاروں شانے چت گرا ...... اس کا سر زور سے فرش سے ٹکرایا اور منہ سے چیخ نکل گئی۔ تیسری طرف فرزانہ تیار تھی، اس نے اپنی طرف آتے ہوئے نقاب پوش کو غچہ دیا اور اس کے پیچھے پہنچ گئی، پھر فوراً ہی اچھلی اور اس کی کمر پر دونوں لاتیں اس زور سے رسید کیں کہ وہ اوندھے منہ

فرش پر عین خون کے اوپر گرا اور پھسلتا چلا گیا۔

اور یہ سب کچھ چند سیکنڈ کے اندر ہو گیا ...... پہلا نقاب پوش اس طرح آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا، جیسے پتھر کے بت میں تبدیل ہو گیا ہو ...... اس سے پہلے کہ وہ ہوش کے ناخن لیتا ، تینوں اس کے سر پر پہنچ گئے اور اس پر تابڑ توڑ مکے رسید کر ڈالے، وہ بے چارا منہ سے آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

بڑے آئے تھے ہمیں چوہے سمجھنے والے ...... فاروق نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

اگر یہ ہمیں چوہے نہ کہتے تو ہم ان کے ساتھ اتنا برا سلوک نہ کرتے۔ فرزانہ بولی۔

تو پھر کتنا برا کرتے۔ فاروق بول اٹھا۔

چھوڑو ...... ان باتوں کو ...... ہمیں سب سے پہلے ابا جان کو فون کرنا چاہیے اور پھر پولیس کو۔ محمود نے جھلا کر کہا۔

اوہ ہاں! یہ تو ہم بھول گئے۔ فرزانہ جلدی سے بولی۔

بہت خوب!

اچانک ایک آواز دروازے میں سے آئی اور وہ بوکھلا کر مڑے۔

انہوں نے دیکھا، وہاں ایک اور سیاہ پوش کھڑا تھا، اور اس کے ہاتھوں میں سٹین گن تھی۔

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک لاکٹ۔ ایک سراغ

تیمور روڈ کی ساتویں گلی کی گیارہویں منزل کے دروازے پر ایک کار آ کر رکی۔ یہ عمارت تین منزلہ تھی اور ہر منزل کی کھڑکیوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ کار میں سے پانچ لمبے آدمی اترے اور اندر داخل ہو گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ تیسری منزل پر پہنچے۔ تیسری منزل تین کمروں پر مشتمل تھی، وہ درمیانی کمرے کے دروازے پر لگی گھنٹی کے بٹن کو پہلے آہستہ ، پھر ذرا زور سے اور تیسری مرتبہ چند سیکنڈ تک دبایا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا، انہیں اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی ...... شاید وہ پہلے بھی یہاں آتے رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔سامنے دیوار میں ایک

دروازہ اور تھا، اس دروازے کو دھکیلا گیا تو وہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئے ، پھر کمرے کو اندر سے بند کر دیا۔

ایک بڑی سی میز کے پیچھے سنہری فریم والی عینک لگائے ایک سرخ و سفید رنگ کا آدمی بیٹھا تھا، اس کا جسم حد درجے صحت مند تھا، آنکھیں نیلے رنگ کی اور ناک موٹی پکوڑا سی تھی، چہرے پر ایک سرد سی مسکراہٹ آنے والوں کے دل لرزائے دے رہی تھی۔ چند لمحے تک انہیں گھورتے رہنے کے بعد وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

معلوم ہوتا ہے تم ناکام لوٹے ہو۔

آپ کا خیال ٹھیک ہے باس ...... ہمیں وہاں پروفیسر نہیں ملی۔

کیا تم نے پروفیسر کا کام تمام کر

دیا؟ اس نے پوچھا۔

جی ہاں، ہم یہ کر آئے ہیں۔

لیکن ڈائری کیوں نہیں ملی ...... میں نے بتایا تھا کہ ڈائری یا تو گنبد نما عمارت کی کسی الماری میں ملے گی یا پھر تجربہ گاہ کی میز کی دراز ہیں۔

ہم نے صرف ان دونوں جگہوں کی ہی اچھی طرح تلاشی نہیں لی، بلکہ پوری کوٹھی ، تجربہ گاہ اور رسد گاہ کی چھان بین کر ڈالی، لیکن ڈائری کہیں نہیں ملی، البتہ ایک عجیب بات ضرور محسوس ہوئی ہے۔

اور وہ عجیب بات کیا ہے، تمھاری ناکامی نے مجھے مایوس کر دیا ہے، اب تم پانچویں میری سزا سے بچ نہیں سکو گے۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔

لیکن باس اس میں ہمارا کیا قصور

...... اگر ڈائری وہاں موجود ہوتی تو ہم ہر حال میں لے کر آئے۔

پہلے وہ عجیب بات بتاؤ۔ اس نے اس کی بات کی طرف دیئے بغیر کہا۔

ہم کوٹھی کے اندر پائپ کے ذریعے داخل ہوئے تھے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ صدر دروازے تو اندر سے بند ہی نہیں تھا۔

یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا۔

تین بجے پروفیسر سے ملنے عین اس وقت آئے تھے۔ جب ہم تلاشی کا کام ختم کر کے پروفیسر کے کمرے میں جمع ہوئے تھے۔

وہ کہاں سے آ ٹپکے؟ باس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جی ...... پتا نہیں ...... وہ پروفیسر کو انکل کہہ رہے تھے،

شاید اس کے پڑوسی ہوں گے، بہرحال ہم نے انہیں بھی کمرے میں بند کر دیا۔

تو پھر ...... اس میں عجیب بات کیا ہوئی؟ اس نے جھلا کر پوچھا۔

آپ نے بتایا تھا کہ دروازے اندر سے بند ہو گا، کیوں کہ پروفیسر ذاکر نے خطرے کی بو سونگھ لی ہے، پھر آخر دروازہ کیوں کھلا تھا۔

ہوں! بات سوچنے کی ہے، کوئی اور بات ؟ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

جی ہاں! پروفیسر ہمیں ہیٹ پہنے ہوئے ملا تھا، جب ہم نے اس کے سینے میں خنجر اتارا اور وہ گرا تو اس کا ہیٹ فرش پر گر گیا تھا۔

یہ کیا تفصیل بتا رہے ہو، آخر ان باتوں سے تم مجھے کون سی عجیب بات بتانا چاہتے ہو۔ اس مرتبہ باس کی آواز

تیز ہو گئی اور بولنے والا تھرتھر کانپنے لگا۔

بات دراصل یہ ہے باس کہ رخصت ہونے سے پہلے جب ہم نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی تو ہمیں میز پر رکھا ایک اور ہیٹ نظر آیا۔

ایک اور ہیٹ ، کیا مطلب ؟ باس چونکا۔

جی ہاں ...... پروفیسر کا ہیٹ تو فرش پر پڑا تھا، پھر وہاں دوسرے ہیٹ کا کیا کام تھا۔ دونوں ہیٹ تقریباً ایک جیسے تھے، اس لیے پروفیسر ایک ہی وقت میں ایک جیسے ہیٹ تو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

نہیں ...... تم نے یہ بات بہت کام کی بتائی۔ باس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے

وہاں پہنچنے سے پہلے کوئی شخص ان سے ملنے آیا ہو اور وہ اپنا ہیٹ اپنا بھول گیا ہو۔

بالکل ہو سکتا ہے، بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ پروفیسر ذاکر نے خطرے کی بو سونگھ کر ڈائری اس ہیٹ والے حوالے کر دی ہو۔ باس نے جلدی سے کہا۔

اور اسی لیے ہم وہ ہیٹ اٹھا لائے ہیں۔

اوہ! خوب! باس نے خوش ہو کر کہا۔ جانی تم نے یہ کام کیا ہے، لاؤ ہیٹ مجھے دو، کیا وہ یہی ہے۔ جو تم نے ہاتھ میں تھاما ہوا ہے۔

جی ہاں! یہ کہہ کر جانی نے ہیٹ میز پر رکھ دیا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔

اس خوشی میں تمہاری سزا معاف کر

دینے کو جی چاہتا ہے۔ باس نے پرجوش آواز میں کہا۔ وہ ہیٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

بہت بہت شکریہ باس!

باس نے ہیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کا اندرونی کپڑا الٹ دیا ، اس میں ایک ننھا سا کارڈ موجود تھا اور کارڈ پر ایک نام لکھا ہو اتھا۔

نام پڑھتے ہی باس کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

☆

انسپکٹر جمشید موٹر سائیکل پر بیٹھے پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ محمود ، فاروق اور فرزانہ پروفیسر ذاکر کے گھر کیا کرنے گئے، وہ تو پروفیسر داؤد کے ہاں گئے تھے۔ دوسری حیرت اس پر ہوئی کہ پروفیسر داؤد کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ خطرے میں ہیں۔ ان خیالات میں گھرے وہ پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ موٹر سائیکل سے اتر کر وہ دروازے پر پہنچے۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا، انہوں نے گھنٹی بجانے کی کوشش نہیں کی، اندر گھستے چلے گئے۔ پورا مکان خوفناک خاموشی کی لپیٹ میں تھا، انہوں نے عجیب قسم کی بے

چینی محسوس کی، ان کے قدم تیز ہو گئے۔ وہ ہر قسم کی احتیاط سے بے نیاز ہو گئے۔ راہداری کے آخری سرے پر انہیں ایک کمرے میں روشنی نظر آئی، ساتھ ہی کسی کتے کے رونے کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، یہ پہلی آواز تھی، جو انہوں نے سنی، بوکھلاہٹ کے عالم میں انہوں نے دروازہ کھول دیا اور پھر دھک سے رہ گئے۔ اس کمرے کا منظر ابھی تک وہی تھا جو تھوڑی دیر پہلے محمود، فاروق اور فرزانہ نے دیکھا تھا، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چند لمحے تک کمرے کے منظر کو دیکھتے رہے، کتے نے بھی ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا ، کمرے میں لاش اور کتے کے سوا کوئی نہیں تھا، وہ جلدی سے باہر نکلے اور ساتھ والے

کمرے کے دروازے کو دھکیل کر دیکھا، وہ بند تھا، دروازے کے اندر ہی لگا تالا لگا دیا گیا تھا، انہوں نے دوسرے کمروں کے دروازوں کو بھی جلدی جلدی دیکھا، ایک اور کمرے کا دروازہ بند ملا، باقی دو کمرے خالی پڑے تھے۔ آخر انہوں نے جیب سے ایک چابیوں کا گچھا نکالا اور بند کمروں میں سے ایک کے تالے پر اسے آزمانے لگے، تیسری چابی نے ہی تالا کھول دیا، انہوں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گئے۔

دوسرے ہی لمحے ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کمرے کے فرش پر ایک لڑکا اور تین جوان آدمی لمبے لمبے لیٹے تھے، پہلی نظر میں وہ انہیں مردہ نظر آئے۔ پھر بغور

دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے، انہوں نے جھک کر ایک نبض ٹٹولی ...... دلوں کی دھڑکنیں محسوس کی، وہ چاروں زندہ تھے اور صرف بے ہوش تھے، چند لمحے کے لیے وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

اچانک انہیں یاد آیا ، وہ تو یہاں محمود، فاروق اور فرزانہ کی زندگیاں بچانے آئے تھے، انہیں جلد ہی دوسرے کمرے کا خیال آیا، چابیوں کے گچھے سے اسے کھولنے میں بھی دیر نہ لگی ، وہ اندر داخل ہوئے اور پھر ان کا رنگ اڑ گیا۔

کمرے کے فرش پر محمود ، فاروق اور فرزانہ بے ہوش پڑے تھے، ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ لاش والے کمرے میں انہیں فون نظر آیا تھا، وہ اس

کمرے کی طرف دوڑے اور دو تین جگہ فون کیے، پھر غسل خانے میں سے ایک جگ میں پانی لے کر ساتوں بے ہوش آدمیوں پر چھڑکتے رہے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہوش نہ آیا، اب انتظار کرنے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے سول ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب اپنے دو نائبوں کے ساتھ وہاں پہنچے، بے ہوشوں کو ہوش میں لانے کا کام انہوں نے اپنے ذمے لیا اور انسپکٹر جمشید لاش والے کمرے میں آئے، کیونکہ انہوں نے ابھی اس کمرے کا غور سے جائزہ نہیں لیا تھا۔ وہ ایک ایک انچ پر نظر دوڑانے لگے، اچانک وہ جھکے اور ایک چمکدار چیز چٹائی سے اٹھالی یہ ایک لاکٹ تھا اور لاکٹ کے اندر

ایک آدمی کی ننھی سی تصویر تھی، چند لمحے تک وہ تصویر کو غور سے دیکھتے رہے ، یہ ایک نوجوان آدمی کی تصویر تھی جس کی ناک کی عین نوک پر سیاہ رنگ کا ایک تل تھا، انہیں یوں محسوس ہوا، جیسے اس تل کو وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکے ہیں، آخر انہوں نے لاکٹ جیب میں رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد اکرام اور پولیس والے بھی آ گئے انہوں نے اپنی کاروائی شروع کر دی تو انسپکٹر جمشید اکرام کو ایک کونے میں لے گئے اور لاکٹ میں لگی تصویر اسے دکھا کر بولے۔

اس شخص کو جانتے ہو۔

جی ہاں! یہ شارو ہے، سزا یافتہ ہے، لیکن جیل سے مت آزاد ہونے کے بعد اسے ایک شریف آدمی کے گھر

ملازمت کر لی ہے اور اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

بہت خوب! ہمیں اس سے ملنا ہو گا ، اگر وہ ایک شریف آدمی کے گھر ملازمت کر رہا ہے۔ تو پھر اس کے لاکٹ کا یہاں کیا کام؟ انہوں نے کہا۔

بہت بہتر، کیا ابھی چلنا ہے۔

ذرا یہاں موجود بے ہوش لوگوں کے ہوش میں آنے کا انتظار ہے۔ انہوں نے کہا، پھر بولے۔

تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کے ہاں ملازمت کر ہا ہے۔

شیخ سرفراز علی کے۔ انہوں نے کہا۔

شیخ سرفراز علی ...... وہ ریٹائرڈ فوجی۔ انسپکٹر جمشید یاد کرنے کے انداز میں بولے۔

جی ہاں! وہی ...... اکرام بولا۔

اس کا مطلب ، ہمیں اس کے گھر جانا پڑے گا۔ جی ہاں ! سنا ہے وہ دن رات شیخ سرفراز کے ہاں ہی رہتا ہے۔ اکرام بولا۔

بہت خوب! تو آؤ ، ذرا ڈاکٹر صاحب سے معلوم کر لیں۔

ڈاکٹر صاحب! ابھی تک بے ہوش آدمیوں کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے، یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب ...... یہ اب تک ہوش میں نہیں آ سکے!

انہیں بہت نشلی دوا سنگھائی گئی ہے، بلکہ زہریلی ...... اس کا اثر دور ہونے میں دیر لگے گی، میں نے سب کو ایک ایک انجکشن دیا ہے، امید کہ ایک

گھنٹے تک بے ہوش میں آ جائیں گے۔

اوہ ...... فکر والی تو کوئی بات نہیں۔ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

جی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔

تو آؤ اکرام...... ہم اتنی دیر شارو سے مل آئیں۔

بہت خوب! چلیے۔

ڈاکٹر صاحب! اگر ان کو ہوش آ جائے تو محمود ، فاروق اور فرزانہ سے کہیے گا ، وہ یہیں میرا انتظار کریں۔

بہت بہتر! ڈاکٹر صاحب نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔

اکرام کو شیخ سرفراز علی کا پتا معلوم تھا، اس لیے وہ جیپ میں بیٹھ کر جلد ہی وہاں پہنچ گیا، لیکن آخر یہ رات کا وقت تھا اور سردیوں کے دن ...... انہیں تین بار دروازے پر دستک دینا

پڑی، تب کہیں جا کر دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے آدمی نے سر باہر نکالا۔

جی فرمائیے، کیا بت ہے؟ اس نے پوچھا۔

ہمیں شیخ سرفراز صاحب سے ملنا ہے۔

وہ اس وقت اپنی خواب گاہ میں جا چکے ہیں۔ ملازم نے منہ بنا کر کہا۔

تمہارا کیا نام ہے؟ انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

میرا نام اسلام دین ہے۔ وہ گڑبڑا گیا۔

اچھا تو اسلام دین صاحب ...... شیخ صاحب کو جا کر بتا دو ، محکمہ سراغ رسانی سے دو آدمی آئے ہیں اور کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔

اوہ! آیئے...... اندر تشریف رکھیے۔

بوڑھے اسلام دین نے ڈرے ڈرے لہجے

میں کہا۔

چلو۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے، یہ ایک صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا کمرہ تھا، صوفہ سیٹ اور کرسیاں اچھی قسم کی تھیں، دیواروں پر تصویر لگی ہوئی تھیں، جن میں زیادہ تر فوجیوں کے گروپ فوٹو تھے اور ان میں ضرور شیخ سرفراز علی بھی شامل تھے، ظاہر ہے یہ فوج کے زمانے کی تصویریں تھیں۔

اچانک انہوں نے قدموں کی آواز سنی، وہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے ...... ایک لمبا تڑنگا اور پتلا دبلا سا آدمی اندر داخل ہوا، اس کی آنکھیں بھوری ، چہرہ رعب تھا۔ جس پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ میں ہلکی سی لنگراہٹ تھی، شاید

فوج میں رہتے ہوئے زخمی ہوا تھا۔

مجھے شیخ سرفراز علی کہتے ہیں۔ اس نے اندر آتے ہوئے اپنا تعارف کرایا، آواز ملائم تھی۔

میں انسپکٹر جمشید ہوں اور یہ سب انسپکٹر اکرام ہیں، ہمارے تعلق محکمہ سراغ رسانی سے ہے۔

اس وقت کیسے تکلیف کی۔

ایک ضروری معاملہ ہے۔ کیا شارو نام کا کوئی آدمی آپ کے ہاں ملازم ہے۔ انہوں نے پوچھا۔

جی ہاں ! کیوں کیا ہوا؟ اس کے لہجے میں حیرت جھلکی۔

اور کیا وہ اس وقت گھر میں ہی موجود ہے۔

جی ہاں! وہ دن رات یہیں رہتا ہے، لیکن بات تو بتایئے۔ وہ پریشان ہو

کر بولا۔

بات ہم اس کے سامنے ہی بتائیں گے، ذرا اسے بلوا لیجئے۔

اچھی بات ہے۔ یہ کہہ کر اس نے صوفے کے اوپر دیوار میں لگا ایک بٹن دبایا۔جلد ہی بوڑھا اسلام دین پھر اندر داخل ہوا۔

شارو کو بلا لاؤ۔

شارو کو ...... اسلام دین کا منہ بن گیا۔

ہاں ہاں، شارو کو ...... کیا تم اونچا سننے لگے ہو۔ شیخ سرفراز علی نے کہا۔

جی ...... جی نہیں میں ابھی اسے بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ بوکھلا ہوا سا باہر نکل گیا۔

جلد ہی شارو اندر داخل ہوا، اس کی ناک کی نوک پر ابھرا ہوا تل صاف

نظر آ رہا تھا، اندر موجود لوگوں پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکا، لیکن پھر سکون ہو گیا۔

آپ کو بہت عرصے بہت دیکھ رہا ہوں انسپکٹر صاحب۔

میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ مسکرائے، پھر بولے۔ شارو تمہارے پاس ایک لاکٹ ہوا کرتا تھا ...... ہمیں ایک لاکٹ ملا ہے، اس میں تمہاری تصویر بھی ہے، اس لیے ہم تمہیں وہ لاکٹ لوٹانے آئے ہیں، کیونکہ اس کی زنجیر سونے کی ہے۔ وہ کہتے چلے گئے۔

بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب۔ آپ نے بہت تکلیف کی، میں خود اپنے لاکٹ کے لیے پریشان تھا، یہ تین دن پہلے گم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

اوہو۔ اچھا۔ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو

کر کہا۔

جی ہاں! اس کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لاکٹ نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔

یہی ہے نا؟ انہوں نے کہا۔

جی ہاں! بالکل یہی ہے ...... وہ جلدی سے بولا اور لاکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ، لیکن انسپکٹر جمشید نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ذرا ٹھہرو۔ یہ لاکٹ کب گم ہوا تھا۔

آج سے تین دن پہلے۔ اس نے کہا۔

تم نے یہ نہیں پوچھا ...... یہ کہاں سے ملا ہے۔ انسپکٹر جمشید نے پراسرار لہجے میں کہا۔

چلیے۔ بتا دیں، مجھے پوچھنے کا خیال

نہیں رہا۔

یہ ایک ایسے کمرے سے ملا ہے، جس میں ایک لاش پڑی پائی گئی ہے، اس شخص کو خنجر سے قتل کیا گیا ہے اور لاش کے پہلو میں الاکٹ پڑا تھا، تم اس پر کہیں کہیں خون لگا دیکھ سکتے ہو۔ انسپکٹر جمشید یہ کہتے وقت مسکرائے۔

نہیں !! شارو زور سے چیخا۔

اور تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے، شیخ صاحب ...... کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے ، شارو ایک سزا یافتہ آدمی ہے، یہ ایک ماہر جرائم پیشہ رہا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ ایک بڑے آدمی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

جی ہاں ! مجھے یہ باتیں معلوم ہیں، اس نے خود ہی بتائی گئی تھی، یہ بہت

پریشان تھا اور ایماندارانہ زندگی گزارنے کے لیے بے چین بھی۔ چنانچہ میں نے اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا، مجھے گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی کی ضرورت تھی اور یہ بات ہے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی۔ شیخ سرفراز علی کہتا چلا گیا۔

بہت خوب، لیکن اب آپ کیا کہتے ہیں، جب کہ اس کا لاکٹ ایک لاش کے پاس پایا گیا ہے۔

اس نے لاکٹ گم ہونے کا ذکر مجھ سے بھی کیا تھا اور میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرا دے معلوم نہیں اس نے کرائی یا نہیں۔

جی ہاں، میں نے رپورٹ درج کرائی تھی۔

کیا !!! انسپکٹر جمشید چلا اٹھے۔ اکرام بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

کون سے تھانے میں درج کرائی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

اسی علاقے کے۔ نیو ٹاؤن کے تھانے میں۔

شیخ صاحب۔ میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔

جی ہاں، بڑے شوق سے۔ اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے تھانے میں فون کیا اور پھر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ شارو نامی ایک آدمی نے اپنے لاکٹ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی، انسپکٹر جمشید نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور رکھ دیا۔ کیونکہ انہیں ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔

اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نے شارو کو پھنسانے کی کوشش کی تھی، یہ تو شاید عقل مندی کر گیا کہ اس نے رپورٹ درج کرا دی، ورنہ اس وقت اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نظر آتیں۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت انسپکٹر جمشید نے شارو سے کہا تھا۔

شارو، ابھی تم شک سے بری نہیں ہوئے، میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ شہر سے باہر جانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا، اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو تمہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے، ایک پبلک فون بوتھ سے انسپکٹر جمشید نے کسی کو فون کیا اور پھر دونوں پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جونہی وہ کوٹھی کے دروازے پر پہنچے، ان

کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

وہ کیا کہتے ہیں

ڈاکٹر صاحب بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے، آخر ان کی کوشش بار آور ہوئی اور سب سے پہلے محمود نے آنکھ کھولی، اس نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، چند لمحے تک پلکیں جھپکاتا رہا پھر چونک اٹھا، اسے یاد آیا، وہ پروفیسر ذاکر کی لاش والے کمرے میں تھے ، وہاں ان کی جھڑپ چار نقاب پوشوں سے ہوئی تھی اور وہ انہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن عین اس وقت ایک پانچواں نقاب پوش سٹین گن لیے وہاں آ گیا تھا اور انہیں ہاتھ اوپر کرنے پڑ گئے تھے، پھر اچانک ان کی ناکوں میں کوئی تیز بو گھسی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔

میں کہاں ہوں۔

پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کے ایک کمرے میں ...... فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے والد سے یہاں پہنچ چکے ہیں، اس وقت وہ سب انسپکٹر کے ساتھ کہیں گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں تم ان کا یہیں انتظار کرنا۔

اوہ اچھا۔ محمود کے منہ سے نکلا اور پھر پریشانی کے عالم میں پیشانی ملنے لگا۔

کیا بات ہے، کیا تم گھبراہٹ محسوس کر رہے ہو۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

جی۔ جی نہیں ...... بات یہ ہے کہ مجھے کوئی بات رہ رہ کر یاد آ رہی ہے۔

ذہن کو پریشان مت کرو، وہ خود بخود یاد آ جائے گی۔

اسی وقت فاروق نے ایک آہ بھری

اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے، اسے بھی فوراً ہی سب کچھ یاد آ گیا۔ اور ادھر فرزانہ کی آنکھ کھلی، ادھر محمود کو وہ بات یاد آ گئی، وہ اچھل کھڑا ہو گیا۔

ارے ارے ...... لیٹے رہو ...... تمہیں زہریلی گیس سنگھا گئی ہے اور اس کا اثر ابھی پوری طرح زائل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب گھبرا کر بولے۔

میں ابھی آ کر لیٹ جاتا ہوں، پہلے میں لاش والے کمرے پر ایک نظر ڈال آؤں ، اگر وہ چیز وہاں موجود ہے، تب فکر کرنے والی کوئی بات نہیں ہو گی۔

تم کس چیز کی بات کر رہے ہو، میرا ماتحت دیکھ آئے گا، تمہارے لیے چلنا پھرنا درست نہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

آپ فکر نہ کریں، مجھے کچھ نہیں ہو گا ، لیکن اگر میں یہاں لیٹا رہا تو شاید ساری عمر پچھتانا پڑے۔

یہ کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا ، فاروق اور فرزانہ اسے حیرت زدہ انداز میں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، پھر وہ بھی اٹھے اور اس کے پیچھے لپکے۔

ارے ارے ...... تم کہاں چلے۔ ڈاکٹر صاحب نے بوکھلا کر کہا، لیکن انہوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

عجیب بچے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے اور پھر پروفیسر ذاکر کے گھر کے افراد کی طرف متوجہ ہو گئے، پھر انہیں خیال آیا کہ انسپکٹر جمشید نے ان سے کہا تھا، بچے یہیں رہ کر ان کا انتظار کریں، انہوں نے سوچا، کہیں وہ گھر

سے باہر نہ نکل جائیں۔ یہ سوچ کر وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف لپکے، جس میں تھوڑی دیر پہلے پروفیسر ذاکر کی لاش ملی تھی۔

محمود کمرے میں داخل ہوا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا، لاش اب یہاں سے اٹھائی جا چکی تھی اور خون بھی صاف کر دیا گیا تھا، کتے کو شاید باہر لے جا کر باندھ دیا گیا تھا، کمرے میں ابھی عملے کے دو تین آدمی پاوڈر چھڑک کر انگلیوں کے نشانات اٹھا رہے تھے۔

وہ ...... وہ ...... کہاں گیا۔ محمود نے ہکا بکا ہو کر کہا۔

کیا کہاں گیا۔ فاروق نے بھی اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میں تم سے نہیں پوچھ رہا۔ محمود

جھلا گیا۔

تو کیا میرے فرشتوں سے پوچھ رہے ہو، یا ان دیواروں سے پوچھ رہے ہو، دیواروں کے کان تو شاید ہوتے ہیں، لیکن زبان نہیں ہوتی۔ فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

اس وقت فضول بات ہرگز نہ کرنا۔ تم نہیں جانتے ، کسی کی زندگی خطرہ میں ہے۔

کیا مطلب؟ فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔ خاموش رہو۔ یہ کہہ کر محمود آگے بڑھا اور ماہرین میں سے ایک سے پوچھا۔

یہاں میز پر ایک ہیٹ رکھا ہوا تھا۔

ہیٹ ...... نہیں تو ...... ہم یہاں اس وقت ہیں۔ جب یہاں سے ابھی لاش اٹھوائی نہیں گئی تھی، یہاں تو ہمیں فرش

پر صرف ایک ہیٹ ملا ہے۔اوہ ...... تو یہ کیا وہ اسے لے گئے۔

محمود نے خوفزدہ انداز میں کہا، فاروق اور فرزانہ دھک سے رہ گئے، انہوں نے زندگی میں محمود کو اس قدر خوفزدہ پہلے کبھی شاید ہی دیکھا ہو گا، ابھی وہ یہ پوچھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ کیا ماجرا ہے، محمود اچانک مڑا، اس نے کمرے سے باہر چھلانگ لگائی اور پھر بجلی کی طرح صدر دروازے کی طرف دوڑ پڑا، اس نے اپنے پیچھے ڈاکٹر کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔

ارے ارے تمہارے والد نے کہا تھا۔

لیکن اتنی دیر میں وہ باہر نکل چکا تھا۔ یہ دیکھ کر فاروق اور فرزانہ کے ہوش اڑ گئے، ان کے ہاتھ پیر پھول

گئے ...... انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ ، دروازے کی طرف چھلانگیں لگا دیں اور یہ جا ...... وہ جا ...... ڈاکٹر صاحب ارے ارے ہی کرتے رہ گئے۔ پھر دروازے کی طرف دوڑے کہ شاید انہیں روک سکیں۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلے تو انہوں نے تینوں کو سڑک پر پاگلوں کی طرح بہت دور دوڑتے دیکھا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے، ان کے منہ سے نکلا۔

اف خدا ...... یہ تینوں تو پاگل ہو گئے ہیں۔

عین اس وقت انہوں نے ایک گاڑی کے بریک چرچرانے کی آواز سنی۔

انہوں نے چونک کر دیکھا اور پھر بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

☆

گھنٹی کی آواز نے پروفیسر داؤد کے ہوش اڑا دیئے۔ انہوں نے گھبرا کر شائستہ سے کہا۔

بیٹی! ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔

جی ......کیا مطلب؟

اس سے پہلے کہ وہ کس طرح اندر داخل ہو جائیں، ہمیں ایک کام کرنا ہے۔ پروفیسر بولے۔

اور وہ کیا کام ہے۔

ایک ڈائری کو کہیں چھپانا ہے۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ کیا مطلب کیسی ڈائری۔

ان باتوں کا وقت نہیں بیٹی ...... دشمن دروازے پر پہنچ چکے ہیں اور جب وہ دیکھیں گے کہ ہم دروازہ نہیں کھول رہے ہیں تو کسی اور طرح اندر گھسنے

کی کوشش کریں گے۔

کاش اس وقت محمود، فاروق اور فرزانہ یہاں ہوتے۔ تو آپ انسپکٹر جمشید کو کیوں نہیں بلا لیتے۔ اوہ ہاں! یہ ٹھیک ہے ، لیکن وہ تو پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو چکے ہوں گے۔

تو آپ وہاں فون کر دیں۔ شائستہ نے کہا۔

افسوس ! میں یہی نہیں کر سکتا ...... وہاں تو محمود، فاروق اور فرزانہ خود خطرے میں ہیں۔

ہوں ...... تو پھر پولیس اسٹیشن کو فون کر دیں اور انہیں ساری صورت حال جلدی جلدی سمجھا دیں، اتنی دیر میں دروازے پر جا کر انہیں باتوں میں لگاتی ہوں۔

ہاں! یہ ٹھیک رہے گا، فرزانہ یہاں

ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی۔ انہوں نے کہا۔ پھر بولے۔

ٹھیک ...... تم جاؤ ...... میں پہلے فون کروں گا اور پھر ڈائری کو کسی جگہ چھپاؤں گا ...... اس کے بعد ہم یہ سوچیں گے کہ انہیں اندر داخل ہونے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اور اگر داخل ہوتے نظر آئے تو ہم کہاں چھپ سکتے ہیں۔

اچھا ابو۔ شائستہ نے کہا اور دروازے کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت تیسری گھنٹی بجائی گئی اور اس مرتبہ کافی لمبی گھنٹی تھی۔

کیا بات ہے، کون ہے دروازے پر۔ شائستہ نے قدرے بلند اور جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

دروازہ کھولو، ہمیں پروفیسر داؤد سے

ملنا ہے۔

لیکن وہ آرام کرنے کے لیے جا چکے ہیں۔ اس نے کہا۔ ہمیں ان سے بہت ضروری کام ہے، ان کی ایک چیز کے بارے میں بات کرنی ہے۔

اور وہ کیا چیز ہے۔ شائستہ نے پوچھا۔

یہ ہم انہیں ہی بتا سکتے ہیں۔ باہر سے غصیلے لہجے میں کہا گیا۔

اچھی بات ہے ، میں انہیں اطلاع دیتی ہوں ، تمہارا نام کیا ہے۔

ناموں کو چھوڑا ، تم دروازہ کھول کر پہلے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور پھر پروفیسر کو جا کر اطلاع دو۔ باہر سے کہا گیا۔

مجھے افسوس ہے، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اور جب تک آپ نام نہیں

بتائیں گے، میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع بھی نہیں دے سکتی۔ کیونکہ ان کی ہدایت یہی ہے۔

ٹھیک ہے ہمارے نام سرفراز، حامد اور شاکر ہیں۔ باہر سے جواب ملا۔

شائستہ مسکرا دی، وہ سمجھ گئی کہ نام فرضی بنائے گئے ہیں۔ وہ مڑی اور اندر آئی، یہاں پروفیسر داؤد منہ کھولے گم صم بیٹھے تھے۔

کیا ہوا ابو ......؟

ہم بری طرح پھنس گئے ہیں بیٹی ...... ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں اور یہ کوٹھی اب ہمارے لیے پنجرہ بن گئی ہے۔ انہوں نے بتایا۔

اوہ! شائستہ دھک سے رہ گئی۔

وہ کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر نے پوچھا۔

ان کا کہنا ہے کہ آپ کی ایک

چیز کے بارے میں بات کرنی ہے۔

اوہ! نہیں بیٹی ...... ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔ اس طرح ہمیں کچھ وقت تو مل ہی جاتا ہے۔ وہ کوٹھی کے پچھلے حصے میں لگے پائپ کے ذریعے چھت تک آ سکتے ہیں۔ شائستہ بولی۔

تم جلدی سے چھت کا زینہ بند کر آؤ، اس طرح وہ چھت سے نیچے نہیں آ سکیں گے۔ پروفیسر جلدی سے بولے۔

بہت اچھا۔ شائستہ نے کہا اور دوڑتی ہوئی اوپر چڑھ گئی، پھر جلد ہی واپس آ گئی۔

کیا آپ وہ ڈائری چھپا چکے ہیں۔

ہاں! چھپا چکا ہوں، لیکن بیٹی میں تمہیں بتاؤں گا نہیں کہ کہاں چھپائی ہے۔

ٹھیک ہے ، نہ بتانا بہتر ہے، نہ

جانے کیا چکر ہے اگر مجھے کچھ معلومات حاصل ہو گئیں اور دشمن اندر آنے میں کامیاب ہو گئے تو کہیں میں ڈرکر بتا ہی نہ دوں۔

ہاں! اسی لیے میں نے کہا ہے کہ بتاؤں گا نہیں۔ اسی وقت گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی اور ان کے دل دھک دھک کرنے لگے، کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر انہوں نے دھم کی آواز چھت پر سنی۔

وہ چھت پر آ گئے ہیں بیٹی۔ پروفیسر داؤد نے ڈرے لہجے میں کہا۔

ہاں ابو...... اب ہم کیا کریں۔ شائستہ کے لہجے میں حسرت تھی۔ انہیں نیچے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، زینہ بند ضرور ہے، لیکن وہ اوپر کوئی رسی باندھ کر نیچے لٹک سکتے ہیں۔

اف خدایا! اب کیا ہوگ ا۔

آؤ بیٹی! ہم اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جائیں اور خدا کو یاد کریں وہی ہماری مدد کرے گا، پروفیسر داؤد نے کہا۔

اور دونوں کمرے میں داخل ہو گئے، انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکیوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں، دونوں اپنے دلوں کی دھڑکنیں صاف سن رہے تھے، اچانک انہوں نے دھم کی ایک اور آواز سنی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ان کے رنگ سفید پڑ چکے تھے اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

وہ نیچے بھی اتر آئے بیٹی۔ پروفیسر کے منہ سے اس طرح نکلا جیسے وہ کسی اندھے کنوئیں میں سے بولے ہوں۔

ہاں ابو۔ شائستہ کے لب ہلے۔

اسی وقت دروازے پر کسی نے زور دار ٹھوکر ماری اور پھر دروازہ توڑنے کے لیے زور آزمائی ہونے لگی۔ دونوں تھر تھر کانپنے لگے۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دوڑنے کی رگ

شاید محمود کا دماغ چل گیا ہے۔ فرزانہ نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے کہا۔

ہاں! تبھی تو ہمیں بھی چلا رہا ہے، بلکہ دوڑا رہا ہے۔ فاروق بھی اس کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

لیکن یہ جا کہاں رہا ں ہے۔ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

جن کا دماغ چل جائے، ان کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے ، سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی پاگل ہو چکے ہیں۔ فرزانہ بولی۔

کیوں! تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔

فاروق نے سوال کیا۔ اس لیے کہ ہم بھی تو اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ فرزانہ بولی۔

یہ تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے۔ محمود کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے، فاروق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ محمود کا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ فرزانہ نے اچانک کہا۔

تو پھر تمہارا دماغ چل گیا ، کیونکہ ابھی ابھی تم نے ہی کہا تھا کہ محمود کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا تھا۔ فرزانہ مسکرائی۔

اچھا ! یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی کہ تم کچھ باتیں سوچے سمجھے بغیر بھی کہہ جاتی ہو۔

شکر کرو، معلوم تو ہو گئی۔ فرزانہ نے کہا۔

محمود نے ڈاکٹر صاحب سے بھی تو کہا تھا ...... آپ نہیں جانتے، ایک ایسے شخص کی زندگی خطرے میں ہے جو ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔

ہاں! مجھے یاد ہے اور میں اس وقت سے یہ سوچ رہی ہوں، وہ کون ہے ......ارے ......یہ محمود تو پروفیسر انکل کی کوٹھی والی سڑک پر مڑ گیا ہے۔ فرزانہ نے چونک کر دیکھا۔

اوہ! فاروق بھی زور سے چونکا۔

درمیانی فاصلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا جا رہا ہے، کیا آج محمود کے پر نکل آئے ہیں۔ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

پر تو چیونٹی کے نکل آیا کرتے

ہیں۔ فاروق بولا۔

وہ اور معتوں میں نکلتے ہیں، یہاں بات دوسری ہے۔ تیسری بھی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ آؤ ہم بھی رفتار بڑھا دیں، تاکہ اس کے ساتھ ہی پروفیسر انکل کے دروازے پر پہنچیں۔ فاروق نے کہا۔

لیکن رفتار کیسے بڑھا دیں، ہم تو پہلے ہی پوری رفتار سے دوڑ رہے ہیں۔ فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ محمود ہم دونوں سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے۔ فاروق نے جھلا کر کہا۔

کم از کم اس وقت تو دوڑ رہا ہے۔ فرزانہ بولی۔ وہ اس لیے کہ اس وقت اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں اور جن لوگوں کی دماغی حالت ٹھیک نہیں

ہوتی، ان کی کوئی اور رگ تیز ہو جاتی ہے لہذا اس وقت محمود کی دوڑنے کی رگ تیز ہو گئی ہے۔ فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

دوڑنے کی رگ...... اس رگ کا نام میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنا ہے۔ فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

ابھی تو تم نہ جانے کتنی ایسی رگوں کے نام سنوں گی، جن کے نام تم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنے ہوں گے، شرارت کی تو خیر سنی سنائی بات ہے اور شہ رگ کا بھی تمہیں پتا ہو گا، خدا تعالی جس سے زیادہ نزدیک ہے، ان کے علاوہ بھی کچھ اور رگیں ہوتی ہیں مثلاً ...... بس بس ...... مجھے ان رگوں پر کوئی مضمون نہیں لکھنا۔

فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔ تم دوڑتے

ہوئے بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔
کیوں، کیا دوڑتے ہوئے مذاق کرنے سے کسی ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں دوڑنے سے بھی منع کیا تھا، مگر ہم رکنے والے کب ہیں۔

ہم تو نہیں۔ محمود کے بارے میں ضرور کہہ سکتی ہو، ہم تو محمود کا ساتھ دے رہے ہیں۔

لو بھئی ...... اب تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ محمود کا رخ پروفیسر انکل کی کوٹھی کی طرف ہے۔ فرزانہ نے محمود نے کومڑتے دیکھ کر کہا۔

سوال تو یہ ہے کہ پروفیسر انکل کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے،کیا وہ کوٹھی پہنچ چکے ہیں، کیونکہ وہ تو پروفیسر ذاکر سے ملنے ادھر آئے تھے، لیکن یہاں ان کی

کار نظر نہیں آئی، جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ یہاں آئے ہی نہیں ......لیکن اب میرا خیا ل ہے ، وہ یہاں آئے تھے۔ فرزانہ یہ کہہ کر رک گئی۔

آئے تھے ......اوہ ہاں ...... ضرور یہی بات ہو سکتی ہے۔ محمود کو نہ جانے کیا چیز نظر آئی تھی، جس سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ پروفیسر انکل پروفیسر ذاکر کے ہاں آئے تھے، خیر جلد ہی اس سے معلوم ہو جائے گا، خدا کے لیے رفتار بڑھاؤ۔

دونوں نے جہاں تک ممکن تھا، تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا، لیکن درمیانی فاصلے کو وہ کسی طرح بھی کم نہ کر سکے۔ دوڑتے ہوئے انہیں تقریباً بیس منٹ گزر گئے، لیکن ابھی تک ان کا سانس

نہیں چھولا تھا، آخر پروفیسر داؤد کی کوٹھی انہیں دور سے نظر آنے لے، محمود نزدیک پہنچتا نظر آیا۔

اور پھر انہوں نے دیکھا ...... وہ دروازے کے نزدیک پہنچ کر رک گیا تھا، انہیں حیرت ہوئی۔ وہ اندر کیوں داخل نہیں ہوا۔

وہ لمحہ بہ لمحہ پروفیسر داؤد کی کوٹھی کے نزدیک ہونے لگے۔

☆

اچانک دروازے کے قبضے اکھڑ گئے اور اس کا ایک پٹ دوسری طرف جا پڑا۔ کمرے میں تین نقاب پوش اندر داخل ہوئے، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ہیٹ تھا۔ اس نے ہیٹ پروفیسر داؤد کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

کیوں پروفیسر صاحب۔ یہ آپ کا ہے نا؟

ہاں! تمہیں کہاں سے ملا۔ پروفیسر صاحب کے منہ سے نکلا۔

پروفیسر ذاکر کے ہاں سے۔ تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟ اس نے پوچھا

میں وہاں اکثر جاتا رہتا ہے، پروفیسر ذاکر میرے دوست ہیں، تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو، بات کیا ہے؟ انہوں نے

جلدی جلدی کہا۔

بات تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو، ورنہ دروازے کیوں نہ کھول دیئے، لاؤ پروفیسر سیدھے ہاتھ سے وہ ڈائری نکال دو، ورنہ بہت دکھ اٹھانا پڑے گا۔ اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

کونسی ڈائری۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ پروفیسر داؤد خوف زدہ لہجے میں بولے۔

تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو، جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

میں نہیں جانتا، تم کس ڈائری کی بات کر رہے ہو۔ پروفیسر بولے۔

وہی جو تمہیں پروفیسر ذاکر نے دی ہے اور لانے کی جلدی میں تم اپنا ہیٹ تک وہیں چھوڑ آئے ہو۔

میرے پاس ایسی کوئی ڈائری نہیں۔

پروفیسر نے منہ بنا کر کہا۔ تو پھر کہاں ہے۔

میں کیا جانوں۔ کہاں ہے۔

یہ ایسے نہیں مانے گا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی پروفیسر داؤد نے اپنی ناک میں کوئی تیز بو گھستی محسوس کی، ان کا سر بڑی زور سے چکرایا، وہ لڑکھڑا ئے اور پھر گرتے چلے گئے، گرتے گرتے ان کے منہ سے نکلا۔

مم ...... میری بچی۔

شائستہ چیخ مار کر تیزی سے ان کی طرف بڑھی، فوراً ہی اس نے بھی وہی بو محسوس کی اور اس کا حشر بھی پروفیسر داؤد جیسا ہوا۔

انہیں اٹھا لو۔ ہم ان سے یہاں کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ کسی

وقت بھی پولیس یہاں پہنچ سکتی ہے۔ پہلے نقاب پوش نے کہا۔

بھلا پولیس یہاں کیا کرنے آئے گی؟ دوسرا بولا۔

پروفیسر ذاکر کی لاش ملنے کے بعد وہ سیدھی یہیں آئے گی۔ تو پھر ٹھیک ہے چلو۔ ان دونوں کو اپنے اڈے پر لے چلتے ہیں۔ دوسرے نے کہا اور پھر ان میں سے دو نے مل کر پروفیسر کو اٹھایا اور تیسرے نے شائستہ کو، تھوڑی دیر بعد وہ انہیں ایک کار پر لادے اڑے چلے جا رہے تھے۔

☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سفید کار

پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر انسپکٹر جمشید کو حیرت اس بات ہوئی تھی کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کوٹھی کے دروازے پر اکڑوں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

خیر تو ہے جناب! انہوں نے ڈاکٹر کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔ آپ آ گئے

......شکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نکلا۔ بات کیا ہے؟ آپ کے بچوں کو ہوش آ گیا ہے۔ انہوں نے بتایا۔ اوہ

...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

لیکن جناب ...... عجیب بات یہ ہوئی کہ محمود اٹھتے ہی واردات والے کمرے کی طرف دوڑ گیا، حالانکہ میں نے اسے لیٹنے کی ہدایت بھی کی تھی، لیکن اس

نے کہا کہ ایک ایسے آدمی کی زندگی خطرے میں ہے جسے ہم جان عزیز رکھتے ہیں۔

کیا ...... یہ سن کر انسپکٹر جمشید حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

پھر کیا ہوا؟

پھر فاروق اور فرزانہ بھی اس کے پیچھے چلے گئے اور اس کے بعد محمود دوڑتا ہوا کوٹھی سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے فاروق اور فرزانہ بھی دوڑے، میں نے انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن روک نہ سکا، ان کے پیچھے دوڑتا ہوا یہاں تک آیا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔

کیوں سر پکڑ کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسپکٹر جمشید حیرت زدہ لہجے

میں بولے۔ کیا آپ نہیں سمجھے۔ جی نہیں۔ میرا خیال ہے، ان کے دماغوں پر اس زہریلی گیس کا اثر ہو گیا ہے۔ جس سے انہیں بے ہوش کیا گیا تھا۔ وہ کس طرف گئے ہیں۔ اس سڑک پر گئے ہیں، اب آگے جا کر کس طرف مڑے ہوں گے، میں کہہ نہیں سکتا۔

خیر آپ فکر نہ کریں، میں انہیں تلاش کر لوں گا۔ ان کے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ضرور کسی خاص وجہ سے دوڑے ہیں، کیا باقی لوگ بھی ہوش میں آ گئے ہیں۔

جی ہاں ...... ہوش میں تو آ گئے ہیں، لیکن ابھی مکمل طور پر نہیں۔

بہت خوب، محمود نے لاش والے کمرے میں جا کر کیا چیز کی تلاش کی تھی۔ اس نے اندر موجود ماہرین سے

کچھ پوچھا تھا۔

بہت خوب...... پھر تو ان سے معلوم کرنا پڑے گا کہ اس نے کس چیز کے بارے میں پوچھا تھا۔ اتنا کہہ وہ اکرام کو باہر چھوڑ کر اندر داخل ہوئے اور سیدھے لاش والے کمرے میں پہنچے، یہاں ماہرین ابھی تک موجود تھے۔

محمود نے آپ سے کس چیز کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ ایک ہیٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ جب انہوں نے کمرے میں لاش کو دیکھا تھا اس وقت ایک ہیٹ میز پر رکھا تھا اوردوسرا فرش پر موجود تھا جو پروفیسر ذاکر کا تھا۔

اوہ! تو کیا بعد میں وہ ہیٹ اس کمرے میں نہیں ملا۔ انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

جی نہیں! صرف ایک ہیٹ ہی اس کمرے سے ملا ہے۔ اس نے بتایا۔

انسپکٹر جمشید سوچ میں ڈوب گئے ، پھر انہوں نے جلدی سے پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے۔ لیکن سلسلہ نہ ملا ، فوراً ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ کہ دوسرے طرف کے تار کٹے ہوئے ہیں۔ وہ پریشان ہو گئے، ریسیور جلدی سے کریڈل میں پٹخا اور باہر کی طرف دوڑنے لگے، ڈاکٹر صاحب نے جو انہیں بھی محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرح دوڑتے دیکھا تو مارے حیرت ان کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں او روہ ایک بار پھر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید باہر نکل چکے تھے اور صرف چند سیکنڈ بعد جیپ میں سوار پروفیسر داؤد کی طرف رخ کر رہے

تھے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

☆

کیا بات ہے تم رک کیوں گئے۔ فاروق نے نزدیک پہنچنے پر کہا۔

اوہ! تم بھی آ گئے۔ محمود چونکا۔

تم ہمارے آنے کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ اندر کیوں داخل نہیں ہوئے جب کہ اتنی دور سے دوڑ لگاتے آ رہے ہو۔

اب اندر کیا ملے گا...... یہ دیکھو ...... شائستہ کا ایک سینڈل۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اوہ! تو کیا انہیں یہاں سے لے جایا جا چکا ہے۔ فاروق کے منہ سے نکلا۔

یہی معلوم ہوتا ہے ، آؤ اندر ایک نظر ڈال لیں، میں نے یہاں پہنچتے ہی ایک کار کا بائیں طرف سڑک پر جاتے دیکھا تھا اور اس کا رنگ سفید تھا،

محمود نے بتایا۔

تو پھر اندر جانے کی ضرورت نہیں، جلدی سے کوئی ٹیکسی پکڑ لو۔ فرزانہ نے بوکھلا کر تجویز پیش کی۔

ہاں! یہی ٹھیک رہے گا، ہم اسی سمت میں چلیں گے جس طرف سفید کار گئی ہے، فاروق نے کہا۔

انہوں نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں ، دور دور تک کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔

کیا خیال ہے، فاروق دوڑ لگا دیں۔ محمود نے کہا۔

افسوس! میری رفتار کار سے بہت کم ہے۔ فاروق بولا۔ لیکن کار آگے جا کر کہیں نہ کہیں رک جائے گی، ہو سکتا ہے، کہیں ہمیں نظر آ جائے، ٹیکسی کے انتظار میں یہاں کھڑے رہنا کہاں تک

مناسب ہے۔ تو پھر آؤ۔ فرزانہ بولی اور تینوں دوڑنے لگے۔

اچانک انہیں سامنے سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی، ان کے چہرے کھل اٹھے، ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں بے تحاشا دوڑتے دیکھ کر بریک لگائے اور سڑک کے کنارے کرتے ہوئے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

کیابات ہے بھئی۔

تینوں نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا اور ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گئے اور پھر محمود نے کہا۔

جس طرف سے آپ آئے ہیں، اس طرف چلئے ...... ایک بہت ضروری معاملہ ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سمت میں ایک سفید رنگ کی کار گئی ہے، اس

کار میں ملک کے مشہور و معروف سائنس دان پروفیسر داؤد اور ان کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے، اگر آپ تیز رفتار سے چلیں گے تو ہم آسانی سے اس تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح آپ ملک کے کام آئیں گے، آپ کو ہم پورا پورا بل بھی ادا کریں گے، اور حکومت سے تعریفی سرٹیفکیٹ بھی دلوائیں گے بلکہ شاید کوئی شاندار قسم کا انعام بھی دلوا دیں۔

آپ لوگ ہیں کون؟

ہم ...... وقت ضائع نہ کرنے کے لیے بتا دیتے ہیں، ہم انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں، شاید آپ نے ان کا نام سنا ہو گا ......۔

ہاں ! سنا ہے، میں اب ضرور چلوں گا اور جس قدر تیز آپ کہیں گے

گاڑی چلاؤں گا، چاہے کچھ ہو جائے۔

اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔

بس تو پھر چلیے۔

اس نے ٹیکسی موڑی اور فل سپیڈ پر چھوڑ دی ، ان کی نظریں سڑک پر دور تک جمی تھیں کہ شاید کہیں سفید کار نظر آ جائے، لیکن اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ٹیکسی تقریباً پندرہ منٹ تک اس رفتار سے دوڑتی رہی......

آخر ڈرائیور نے کہا۔

اب کیا کریں جناب ...... خدا جانے وہ کار کس سڑک پر مڑ گئی ہے۔

ڈرائیور نے پوچھا۔

یہ سڑک کون سی ہے؟ فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

تیمور رروڈ۔

بہت خوب! ہم میں سے دو کو

یہیں اتار دیں اور ایک کو واپس اسی جگہ لے چلیں جہاں سے لے کر روانہ ہوئے تھے۔ فرزانہ نے کہا۔

کیا مطلب؟ محمود اور فاروق نے بیک وقت کہا۔

مطلب یہ کہ تم دونوں یہاں اتر کر سفید کار تلاش کرنے کی کوشش کرو، اس سڑک پر مڑنے والی ہر گلی کا جائزہ لے ڈالو، ضرور سفید کار کسی نہ کسی گلی میں مڑی ہے، جس گھر کے سامنے وہ کار نظر آ گئی، بس سمجھ لو، کام بن گیا۔ اس نے کہا۔

لیکن سفید کاریں تو اس شہر میں نہ جانے کتنی ہو ں گی

فاروق نے جھلا کر کہا۔

ہاں! لیکن اس سڑک پر ایک یا دو سے زیادہ نہیں ہوں گی، سفید رنگ

دوسرے رنگوں کی نسبت کم ہوتا ہے، فرض کرو، دو کاریں یا تین کاریں بھی نظر آ جائیں تو تم ان سب کو چیک کرو گے، یہ پروفیسر انکل کی زندگی کا سوال ہے۔ فرزانہ جلدی جلدی کہتی چلی گئی۔ اس پر فاروق کا منہ بن گیا۔ اس نے کہا۔

تو پھر تم کس خوشی میں واپس جا رہی ہو، تم بھی ہمارے ساتھ سفید کار کیوں تلاش نہیں کرتیں۔

میں وہاں جا کر ابا جان کو ساتھ لے کر یہاں آؤں گی، تاکہ ہم جیپ اور موٹر سائیکل کے ذریعے اس کار کو اور بھی دور دور تک تلاش کر سکیں۔

تجویز نہایت معقول ہے۔ محمود نے جلدی سے کہا۔

بہت اچھا۔ اگر یہ معقول تجویز ہے

تو پھر اترو نیچے۔ فاروق نے کہا اور دونوں نیچے اتر آئے، ڈرائیور فرزانہ کو لے کر واپس روانہ ہو گیا اور وہ دونوں ایک ایک گلی میں داخل ہوتے اور کھڑی ہوئی کاروں کا جائزہ لیتے آگے بڑھنے لگے، اندھیرے میں سفید کاروں کو دیکھنا بھی ایک مشکل کام تھا، لیکن ان کے پاس ٹارچ تھی،و ہ اس کی روشنی ڈال کر کاروں کا جائزہ لیتے رہے اور پھر ان کا سر چکرانے لگا، کیونکہ ایک گلی میں انہیں دو سفید کاریں نظر آئیں۔ اور ایک اور گلی میں بھی ایک سفید کار کھڑی دکھائی دی۔

اگر ہم نے اس سڑک کی تمام گلیاں دیکھ ڈالیں تو شاید پندرہ بیس سفید کاریں تو نکل ہی آئیں گی۔فاروق نے گھبرا کر کہا۔

فکر نہ کرو۔ پہلے ہم سب کا سرسری نظرسے جائزہ لیں گے، شاید کسی کار میں کوئی خاص بات نظر آ جائے، مثلاً شائستہ کی کوئی چیز ...... یا پروفیسر داؤد کی کوئی چیز کسی کار کے آس پاس یا پچھلی سیٹ پر نظر آ جائے تو یہ کس قدر شاندار کامیابی ہو گی۔ محمود کہتا چلا گیا۔

ہاں! بہت شاندار ہو گی، لیکن باتوں میں وقت ضائع کرنے سے یہ شاندار کامیابی شاید ہمارے ہاتھ نہ لگے۔ فاروق نے کہا۔

یہ تم کہہ رہے ہو فاروق۔ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔ ہاں! کیونکہ یہ پروفیسر انکل اور شائستہ کی زندگی کا معاملہ ہے۔ فاروق نے پرجوش لہجے میں کہا اور پھر دونوں کاروں کا جائزہ لیتے

ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ ایک بہت مشکل کام تھا، کیوں کر کاریں بے شمار تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے فرزانہ انہیں چکر دے گئی ہو، اگر یہ معاملہ پروفیسر داؤد کا نہ ہوتا تو جھلا کر واپس لوٹ جاتے، لیکن اب وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے ہمت نہ ہاری، اور ایک اور کار کی طرف بڑھنے لگے، یہ تو انہیں نزدیک پہنچنے پر پتا چل سکتا تھا کہ وہ سفید ہے یا نہیں۔

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ڈائری کہاں ہے

تیمور روڈ کی ساتویں گلی اور گیارہویں عمارت کی تیسری منزل کے درمیانی کمرے میں اس وقت پروفیسر داؤد اور شائستہ دو کرسیوں سے بندھے ہوئے تھے ، ان کے علاوہ کمرے میں پانچ نقاب پوش اور ایک آدمی بغیر نقاب کے موجود تھے۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، آنکھیں نیلے رنگ کی اور ناک موٹی پکوڑا سی تھی، وہ ایک میز کے پیچھے کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے کسی سرکاری دفتر میں بڑے عہدے پر ملازم ہو اور اس کے سامنے اس کے ماتحت کھڑے ہوں۔

دیکھو پروفیسر ...... اگر تم صرف اتنا بتا دو کہ وہ ڈائری کہا ں رکھی ہے تو ہم تمھیں فوراً چھوڑ دیں گے، دوسری

صورت میں بہت بری طرح پیش آئیں گے۔ موٹی ناک والے نے کہا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ڈائری میرے پاس نہیں ہے۔ ہم کب کہتے ہیں کہ ڈائری تمہارے پاس ہے، یہ بتا دو ، تم نے اسے اپنے گھر میں کس جگہ چھپایا ہے۔

میں نہیں سمجھتا، تم کس ڈائری کی بات کر رہے ہو۔ پروفیسر جھلا کر بولے۔

باس! یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔ سب سے آگے کھڑے ہوئے نقاب پوش نے کہا۔

ٹھیک ہے جس طرح بھی یہ مانیں ...... مناؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ باس نے مسکرا کر کہا۔

چلو جہانگیر ...... پروفیسر کی بیٹی کے

سر پر شکنجہ کس دو، تم شکنجہ کا ہینڈل اس وقت تک گھماتے رہنا جب تک پروفیسر زبان نہ کھولے۔

بہت بہتر جناب! یہ کہہ کر جہانگیر نامی نقاب پوش آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں لوہے کی کمانیوں سے بنا ایک عجیب و غریب آلہ تھا، اس نے وہ آلہ شائستہ کے سر کے گرد کس دیا، اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

نہیں نہیں، یہ ظلم ہے۔ پروفیسر داؤد چلائے، لیکن شائستہ نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا۔

ظلم تو تم خود اپنے اوپر کرا رہے ہو۔ اگر ڈائری کا پتا بتا دو تو ہم تمھیں فوراً چھوڑ دیں گے۔

لیکن میری بیٹی کا کیا قصور، تم نے شکنجہ اس کے سر پر کیوں ہے، میرے

سر پر کسو نا۔ پروفیسر داؤد تلملا کر بولے۔

اس لیے کہ باپ اپنی تکلیف تو برداشت کر سکتا ہے، لیکن اپنی اولاد کی تکلیف برداشت کرنا اس کے لیے ناممکل ہے، جب شکنجے کو کسا جائے گا تو تمہاری بیٹی کو اپنا سر تڑختا محسوس ہو گا، اس کی چیخیں تمہارے سینے کے اندر ہل چل مچا دیں گی، اس کے منہ سے نکلنے والی سسکیاں تمہاری زبان کو فوراً کھول دیں گی اور تم فرفر بول اٹھو گے، تم ہمیں بتاؤ گے کہ ڈائری کس جگہ چھپا رکھی ہے۔ باس کہتا چلا گیا۔

دیکھو یہ ظلم نہ کرنا جو کچھ کرنا ہے، میرے ساتھ کرو۔ پروفیسر نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

اس شکنجے کی تکلیف برداشت کرنا

بوڑھوں کا کھیل نہیں تم تو فوراً ہی بے ہوش ہو جاؤ گے۔ پھر بھلا ہم ڈائری کا پتا کس سے معلوم کریں گے۔ اس نے کہا۔

اف خدا ...... یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گے۔ پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

ابو ! صبر کریں۔ شائستہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

یا خدا رحم فرما! پروفیسر داؤد بولے۔

رحم تو تم پر ہم بھی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم بات ہی نہیں بتاتے۔ باس نے جھلا کر کہا۔

نہیں نہیں ...... وہ ڈائری میرے پاس نہیں ہے۔

تو پھر کس کے پاس ہے۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

پروفیسر ذاکر ہی بتا سکتے ہیں۔ پروفیسر بولے۔

وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اگر تم نے ڈائری کا پتا نہ بتایا تو اب تمہاری باری ہے، لیکن تم سے پہلے تمہاری بیٹی کو سسکا کر مارا جائے گا اور تم یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔

نہیں! پروفیسر داؤد حلق کے بل گرجے، پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔

تم نے میرے دوست کو ختم کر دیا، اف خدا ......وہ اس وطن کا کتنا ہمدرد تھا، اس نے کتنی مفید چیزیں ایجاد کیں ، تم .... تم ضرور وطن دشمن ہو۔

ان باتوں سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ باس نے غرا کر کہا۔ جہانگیر

تم کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ شکنجے کو کیوں نہیں کستے۔

جہانگیر کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ شکنجے میں لگا سیاہ رنگ کا ہینڈل گھومنے لگا، شائستہ کی کھوپڑی بھنچنے لگی۔ اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی، پروفیسر نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ شائستہ نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے دبا لیے کہ اس کے والد کے کانوں تک اس کی چیخوں کی آواز نہ پہنچے، لیکن کب تک، آخر اس کے منہ سے دل دوز چیخ نکل گئی، پھر تو چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

باس ! کیا چیخوں کی آواز عمارت سے باہر نہیں جائے گی۔ سب سے اگلے نقاب پوش نے کہا۔ نہیں جائے گی، اس کمرے کے سب دروازے اور

کھڑکیاں بند ہیں، ان پر بھاری پردے پڑے ہیں اور اگر تم زیادہ ہی احتیاط کرنا چاہتے ہو تو انگریزی گانوں کی کوئی ٹیپ لگا دو، اس سے بے ہنگم شور پیدا ہو گا اور کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ اس بے ہنگم شور میں کسی کی چیخیں بھی شامل ہیں۔ باس نے ترکیب بتائی۔

لاجواب ترکیب ہے۔ نقاب پوش نے خوش ہو کر کہا۔

کمرے میں بے تحاشہ شور گونجنے لگا، اس میں مردوں اور عورتوں کی چیخیں بھی شامل تھیں اور ان چیخوں میں شائستہ بے چاری کی چیخیں اس طرح گم ہو گئیں جیسے دریا میں کوئی قطرہ۔ اور پھر پروفیسر داؤد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ حلق پھاڑ کے پوری طاقت

سے بولے۔

بند کرو یہ ظلم، میں ڈائری کا پتا بتاتا ہوں۔

ٹیپ بند کر دی گئی، کمرے میں ایک لمحے کے لیے موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ باس چند سیکنڈ تک پروفیسر کو مسکرا کر دیکھتا رہا، آخر بولا۔

تو پھر پروفیسر ذاکر تمھیں ڈائری دینے میں کامیاب ہوگئے تھے اور میرے آدمی عین اس وقت وہاں پہنچے تھے جب تم وہاں سے نکل چکے تھے ...... کیوں ٹھیک ہے نا، اور تم اپنا ہیٹ پروفیسر ذاکر کے کمرے میں بھول گئے تھے۔

ہاں! یہ سب کچھ ٹھیک ہے، جب میں ڈائری لے کر ان کی کوٹھی سے باہر نکل کر اپنی کار میں گیا اور کار کو سڑک پر بھی لے آیا تھا تو میں

نے پانچ سایوں کو دوسری طرف سے آتے دیکھا، میں کچھ دور آگے جا کر رک گیا، پھر میں نے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، کیونکہ پروفیسر ذاکر مجھے بتا چکے تھے کہ وہ خطرے میں ہیں، لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ خطرے کا احساس انہیں کس طرح ہو گیا تھا۔

وہ تمہیں میں بتا دیتا ہوں۔ باس نے کہنا چاہا تھا کہ پھر کسی خیال سے رک گیا اور بولا۔لیکن نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تو فوراً سے پہلے یہ بتاؤ کہ ڈائری کہاں ہے۔

ڈائری میرے ...... ابو! شائستہ زور سے چیخی۔ خدا کے لیے ابو نہ بتائیں ملک کی ایک اہم ایجاد کو دشمنوں کے حوالے نہ کریں۔

کیا کروں بیٹی! مجھ سے تم پر یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ پروفیسر بے چارگی کے عالم میں بولے۔

تو آنکھیں بند کر لیں۔ شائستہ بولی۔

میرے کان تو پھر بھی کھلے رہیں گے، کیونکہ میرے ہاتھ بندگے ہیں اور اگر میں کسی طرح اپنے کان بند بھی کر لوں تو اس احساس سے کس طرح پیچھا چھڑاوں گا کہ میری بچی پر بے تحاشہ ظلم ہو رہا ہے۔

آپ ایک بیٹی کی خاطر پوری قوم کو کیوں خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ شائستہ بولی۔

میں کیا کروں، باپ ہوں، میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اگر یہ لوگ یہ ظلم مجھ پر توڑتے تو میں کبھی انہیں ڈائری کا پتا نہ بتاتا۔

اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، پہلے ڈائری کا پتا بتا دو، پھر باتیں کرتے رہنا، کیونکہ پھر ہم تمھیں باتیں کرنے کے لیے بہت وقت دیں گے، تم اس وقت باتیں کرتے رہنا، جب تک کہ میرے ساتھی ڈائری حاصل کر کے واپس نہیں آ جائیں گے۔

ڈڈ...... ڈائری...... پروفیسر داؤد کے منہ نکلا ہی تھا کہ شائستہ پھر چیخی۔

ٹھہریئے ابو......خدا کے لیے ڈائری کا پتا نہ بتایئے۔

جہانگیر! اس لڑکی کا منہ بند کر دو۔ اب اس کے حلق سے آواز نہ نکلے۔ باس نے غرا کر کہا۔ جہانگیر نے اپنا ہاتھ شائستہ کے منہ پر مضبوطی سے جما دیا، یہ دیکھ کر باس نے کہا۔ ہاں! پروفیسر...... اب بتاؤ، ڈائری کہاں

ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

☆

انسپکٹر جمشید اور اکرام جیپ سے اتر کر تقریباً دوڑتے ہوئے پروفیسر داؤد کی کوٹھی میں داخل ہوئے، ان کی نظر باہر پڑے شائستہ کے سینڈل پر نہیں پڑی تھی اندر داخل ہوتے ہی انسپکٹر جمشید کو فوراً احساس ہو گیا کہ کوٹھی میں کوئی بھی موجود نہیں۔

اکرام اندر کوئی نہیں ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اکرام کے منہ سے نکلا۔

آؤ ...... دیکھیں۔

وہ اندرونی حصے میں داخل ہوئے اور پھر چونک اٹھے۔ پروفیسر داؤد کے کمرے میں چیزیں درہم برہم پڑی تھیں۔ صاف ظاہر ہے انہیں اغوا کیا گیا ہے۔

لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ کہاں

گئے؟ اکرام نے سوال کیا۔

ہو سکتا ہے، وہ ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے ہوں۔ اور اب ہم بھی یہی کریں گے۔لیکن ہمیں کیا معلوم وہ کس طرف گئے ہیں۔

پورے شہر کی پولیس صرف چند منٹ بعد سڑکوں پر نکل آنی چاہیے، کسی بھی کار کو تلاشی لیے بغیر گزرنے نہ دیا جائے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

یہاں سے فون نہیں کیا جا سکتا۔

ٹھیک ہے، یہاں سے نزدیک ہی ایک پٹرول پمپ ہے میں وہاں سے فون کروں گا اور اس کے بعد ہم روانہ ہوں گے۔

تو پھر آیئے چلیں۔

دونوں باہر نکلے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ اسی وقت ایک ٹیکسی آ

کر وہاں رکی تھی، پھر انہوں نے فرزانہ کو ٹیکسی سے باہر نکلتے دیکھا۔

ارے ، فرزانہ تم ...... انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔ محمود اور فاروق کہاں ہیں۔

تیمور روڈ پر۔ تیمور روڈ پر ...... کیا مطلب ...... وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا۔ پروفیسر انکل اور شائستہ کو اغوا کر کے اسی طرف لے جایا گیا ہے۔

بہت خوب! اب ہمیں فوری طور پر فون کر کے اس سڑک کو گھیرے میں لینے کی ہدایت دینی چاہیے۔ انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

پھر انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بل سے بہت زیادہ رقم دیتے ہوئے کہا۔

تم کل مجھ سے آ کر ملنا۔وہ

رخصت ہو گیا تو جیپ میں بیٹھ کر پٹرول پمپ پر پہنچے اور فون کرنے کے بعد جہانگیر روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہاں! فرزانہ ...... اب بتاؤ ...... یہ چکر کیا ہے، کہاں سے شروع ہوا تھا، کیونکہ اس وقت تم مجھ سے آگے آگے رہے ہو اور میں تمہارے پیچھے، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ پروفیسر ذاکر کیوں مار ڈالے گئے، تم لوگ وہاں کس طرح جا پہنچے تھے۔ پروفیسر داؤد کا اس واقعے سے کیا تعلق ہے اور انہیں کیوں اغوا کیا گیا ہے۔

ان تمام باتوں کے تسلی بخش جواب تو میں خود بھی دینے سے لاچار ہوں، اتنا بتا سکتی ہوں کہ ہم پروفیسر انکل اور شائستہ سے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک پروفیسر ذاکر کا فون آیا، پروفیسر

انکل نے ہمیں بتایا کہ پروفیسر ذاکر نے انہیں فوری طور پر بلایا ہے، وہ خود کو خطرے میں محسوس کر رہے ہیں، بس انکل ادھر چلے گئے ، ان کے بعد ہم بھی وہاں بیٹھے نہ رہ سکے۔ اور پروفیسر ذاکر کی کوٹھی تک پہنچ گئے، اندر داخل ہوئے تو کمرے میں ان کی لاش پڑی تھی اور انکل کا کہیں پتا نہیں تھا۔ البتہ محمود کو اس کمرے میں ان کا ہیٹ ضرور نظر آیا تھا۔ پھر کمرے میں چار نقاب پوش آ گئے، وہ اس وقت تک کوٹھی اور تجربہ گاہ میں کوئی چیز تلاش کرتے رہے تھے، ہماری ان سے جھڑپ ہوئی اور پھر ہمیں کسی گیس کے ذریعے بے ہوش کر دیا گیا، ہوش آیا تو محمود ہیٹ دیکھنے کے لیے جھپٹا اور پھر وہ پروفیسر انکل کے گھر کی

دوڑ پڑا، میں اور فاروق بھی پیچھے دوڑے ، لیکن انہیں یہاں سے لے جایا جا چکا تھا، تاہم محمود کو سفید کار سامنے والی سڑک پر جاتی نظر آ گئی تھی، ہم ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ تیمور روڈ کے آخری سرے تک پہنچ گئے، خیال یہی ہے کہ وہ کار تیمور روڈ ہی کی کسی نہ کسی گلی میں مڑ گئی ہے، اب میں محمود اور فاروق کو اس کار کی تلاش پر مامور کر کے یہاں آئی ہوں، تاکہ آپ کو حالات سے آگاہ کیا جا سکے اور آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو سکیں۔ یہ کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی۔

لیکن تم نے یہ کس طرح اندازہ لگا لیا کہ میں یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

ڈاکٹر صاحب کو آپ ہدایت کر کے گئے تھے کہ ہم وہیں ٹھہریں، اس کا مطلب یہی تھا کہ آپ واپس وہیں آئیں گے۔

ہوں ٹھیک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ کسی ایجاد کا چکر ہے، اس ایجاد کی سن گن دشمن ملک کے جاسوسوں کو ہو گئی ہو گی۔ بس وہ ان کے پیچھے لگ گئے ...... پہلے انہوں نے ایجاد خریدنے کی پیش کش کی ہو گی اور ان کے انکار پر انہوں نے ایجاد زبردستی حاصل کرنے کا پروگرام بنایا ہو گا۔

سوال تو یہ ہے کہ انہیں ایجاد کے بارے میں معلوم کس طرح ہو گیا۔

اکرام نے کہا۔ پروفیسر ذاکر کے کسی اسسٹنٹ نے غداری کی ہو گی، یا اسے کوئی بھاری رقم دے کر اس سے

معلومات حاصل کی ہوں گی کہ آج کل پروفیسر کس تجربے پر کام کر رہے ہیں ...... ہمارے ہاں نجانے کتنے غدار ہیں، اگر مسلمانوں میں غدار نہ ہوتے تو آج یہ قوم نہ جانے کہاں ہوتی۔ ٹیپو سلطان جیسے زبردست جرنیل کو غداروں کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ سراج الدولہ بھی مارا گیا ، غرناطہ کے مسلمان غدارکا شکار ہوئے ...... خیر ...... یہ ایک لمبی بحث ہے، انہیں کسی نہ کسی ذریعے سے تو معلوم ہوا ہی ہو گا، اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم پروفیسر ذاکر نے انہیں کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ انسپکٹر جمشید جذباتی آواز میں کہتے چلے گئے۔

لیکن ابا جان، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دشمنوں نے پروفیسر ذاکر کے

کسی مضمون سے اندازہ لگا لیا ہو کہ وہ آج کل کس ایجاد کی فکر میں ہیں، ان کے مضامین سائنسی رسالے میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہاں! اس کا امکان ہے ...... خیر کوئی بات نہیں، یہ تو ہم بعد میں بھی معلوم کر لیں گے، اس وقت تو مسئلہ پروفیسر داؤد تک پہنچنے کا ہے۔ اگر اس ایجاد کا فارمولا اب پروفیسر داؤد کے پاس ہے تو وہ مصیبت میں ہوں گے، بلکہ ان کے ساتھ شائستہ بھی مصیبت میں گرفتار ہو گی...... دشمن کہیں ان پر ظلم توڑ کر اس ایجاد کے فارمولے کا پتا نہ ڈھونڈ لیں۔

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے، اسی وقت جیپ ایک موڑ مڑی اور تیمور روڈ شروع ہو گیا۔

یہاں سے ہمیں دونوں طرف کی گلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

میں دائیں طرف کی گلیوں میں نظر ڈالتی ہوں اور آپ بائیں طرف دیکھیں، انکل اکرام سامنے سڑک پر نظر رکھیں گے۔ یہ کہتے وقت فرزانہ مسکرائی تھی ، جس کا جواب اکرام نے بھی مسکرا کر دیا، اب جیپ کی رفتار آہستہ کر لی گئی تھی، اچانک فرزانہ کے کان کھڑے ہو گئے، اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

رات کے وقت اتنے زور سے ریڈیو کون بجا رہا ہے، انکل ذرا روکیے۔

ہاں! شور کی آواز تو میرے کانوں میں بھی آ رہی ہے اور غالباً دائیں طرف کی اس گلی کے کسی مکان سے آ رہی ہے۔انسپکٹر جمشید سوچتے ہوئے بولے،

پھر چونک اٹھے اور انہوں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

اوہ! جلدی سے جیپ اس گلی میں لے چلو۔

جونہی وہ گلی میں مڑے اور جیپ کی روشنی گلی میں پڑی۔ دو لڑکے اچھل کر سیدھے ہو گئے، وہ ایک کار کے پاس جھکے ہوئے تھے، انہوں نے دیکھا، وہ محمود اور فاروق تھے۔

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کامیابی کا زینہ

تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ انسپکٹر جمشید نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ہم اس کار کا جائزہ لے رہے ہیں، یہ سفید رنگ کی تو ہے ہی ...... اس کے اندر ایک سینڈل بھی پڑا نظر آ رہا ہے، جو شائستہ کا ہے، ایسا ہی ایک سینڈل ہمیں انکل کی کوٹھی کے دروازے پر پڑا نظر آیا تھا۔ محمود نے کہا۔

بہت خوب! اس کا مطلب ہے، ہم نزدیک پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

لیکن آپ ایک دم اس گلی میں کیسے آ پہنچے۔ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

کیا تم یہ شور نہیں سن رہے ہو؟ انسپکٹر جمشید بولے۔ جی ہاں ...... ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا ہے، تو پھر کیا ہوا،

یہ تو آج کل عام فیشن ہے، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر اونچی سے اونچی آواز میں لگائے جاتے ہیں تاکہ محلے میں کوئی سکون سے سو نہ سکے، طالب علم پڑھ نہ سکیں اور بیمار لوگ چین کا سانس نہ لے سکیں، اس میں عجیب بات کیا ہے ابا جان ...... یہ تو ہماری نئی نسل کے نئے فیشن کے نوجوانوں کا شوق ہے، اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے تو پہنچا کرے، انہیں کیا۔ محمود جذباتی آواز میں کہتا چلا گیا۔

ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اس وقت غور کرنے والی بات یہ ہے کہ ریڈیو یا ٹیپ پر کوئی باقاعدہ گانا نہیں لگا ہوا، بلکہ یہ بے ہنگم سا شور ہے جس میں چیخیں بھی شامل ہیں ...... انگریز مرودوں اور عورتوں کی چیخیں جو ناچتے

ہوئے ان کے منہ سے نکلتی ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ کیسے شوقین ہیں جو اس شور کو سن کر خوش ہو رہے ہیں اور پھر اس گلی میں وہ کار بھی موجود ہے جس کی تم لوگوں کو تلاش تھی، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ عمارت یہی ہے جس میں پروفیسر اور شائستہ کو اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

لیکن اس پر شور موسیقی کا اس معاملے سے کیا تعلق؟ فاروق نے سوال کیا۔

عجیب احمق ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ فرزانہ تلملا کر بولی۔

تم تو عقل مند ہو اور سمجھ چکی ہو گی، چلو تم ہی بتا دو۔

وہ لوگ ضرور پروفیسر انکل اور شائستہ

پر تشدد کر رہے ہوں گے، اس طرح ان کے منہ سے چیخیں نکلتی ہوں گی ...... انہوں نے اس خیال سے ریڈیو لگا دیا کہ چیخوں کی آوازیں اس میں شامل ہو جائیں اور آس پاس کے رہنے والوں کو کچھ معلوم نہ ہو، لیکن اس شور نے مجھے اس گلی میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا ہے، یہی چیز ہمارے لیے کامیابی کا زینہ بن گئی ہے۔ وہ کہتے چلے گئے۔

تو پھر دیر کس بات کی ...... آیئے ان پر دھاوا بول دیں، پروفیسر انکل اور شائستہ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ فاروق نے بے چین ہو کر کہا۔

ہاں ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔ اکرام تم سڑک پر جاؤ اور پولیس کو اس گلی کی ناکہ بندی کرنے کی ہدایت

کرو، کوئی شخص بھی فرار نہ ہونے پائے، ابھی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اندر داخل ہونے کے امکانات کیا ہیں، تم اس گلی کے آس پاس ہی رہنا، شاید ہمیں کسی سیڑھی یا کمند کی ضرورت پڑے۔ انہوں نے کہا اور تین منزلہ عمارت کی طرف بڑھے۔

اس کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا اور بہت مضبوط نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے عمارت کے دائیں بائیں دیکھا، لیکن اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔

اب ہم کیا کریں؟ انسپکٹر جمشید پریشان ہو کر بولے۔

دستک کیوں نہ دی جائے۔ محمود نے کہا۔

وہ لوگ خبردار ہو جائیں گے اور ہو

سکتا ہے خود کو بچانے کے لیے پروفیسر داؤد اور شائستہ کو ڈھال بنا لیں۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

تو پھر اس کی صرف ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے۔ اچانک فرزانہ نے کہا۔

مجھے پہلے ہی امید تھی، اس موقعے پر فرزانہ ترکیب بتائے گی۔ فاروق مسکرایا۔

یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ انسپکٹر جمشید چلا اٹھے ...... ہاں فرزانہ ترکیب بتاؤ، جلدی کرو۔

دوسری گلی میں اس مکان کی پشت پر لگنے والا مکان ہو گا، ہم اس کے ذریعے اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

تمہارا مطلب ہے، اس کی چھت کے ذریعے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

جی ہاں۔ اس نے کہا۔

اس امکان کا جائزہ لیا جا سکتا ہے، تم تینوں یہیں ٹھہرو، میں اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں ، اگر اوپر پہنچ گیا تو پھر پہلے نیچے آ کر دروازہ کھولوں گا اور تمہیں ساتھ لے کر اوپر جاؤں گا، تم میں سے ایک اس دوران سڑک پر جا کر اکرام کو ساری صورت سمجھا آئے، تاکہ وہ بھی تیاری کر لے۔

انہوں نے کہا اور دوسری گلی میں جانے کے لیے سڑک کی طرف مڑ گئے ، یہ وہ گن چکے تھے کہ مکان کون سے نمبر پر ہے، دوسری گلی کے مکان گنتے ہوئے وہ ایک مکان کے سامنے رک گئے، دستک کے جواب میں ایک نوجوان آدمی نے دروازہ کھولا۔

انہوں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد

مختصر ترین الفاظ میں اسے بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، وہ فوراً ہی مدد کے لیے تیار ہو گیا اور انہیں لے کر چھت پر آیا۔ لیکن یہ مکان دو منزلہ تھا۔ جب کہ مجرموں کا مکان تین منزلہ تھا، اس مسئلے کا حل سیڑھی کے ذریعے نکالا گیا، نوجوان نے لکڑی مکان کی چھت پر پہنچ گئے ، شور ان کے کانوں سے بدستور ٹکرا رہا تھا، اچانک شور رک گیا اور موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

انسپکٹر جمشید کو یہ خاموشی بہت خوفناک لگی، وہ تیزی سے زینے کی طرف بڑھے۔

☆

میری بچی کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لو، ورنہ میں تمہیں ایک لفظ بھی نہیں بتاؤں گا۔ پروفیسر داؤد جھلا کر بولے۔

اگر اس کے منہ پر ہاتھ ہٹایا گیا تو یہ پھر تمہیں بتانے سے روکے گی۔

لیکن میں اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا ...... میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ پروفیسر داؤد بولے۔

بہت اچھا ...... جہانگیر ...... اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لو ...... باس نے کہا اور جہانگیر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

ابو! آپ بے شک انہیں ڈاری کا پتا بتا دیں، لیکن پہلے میری ایک بات سن لیں۔ شائستہ نے ہاتھ ہٹتے ہی کہا۔

کہو بیٹی۔ پروفیسر جلدی سے بولے۔

ابو! اگر آپ نے ان لوگوں کو ڈائری کا پتا بتا دیا، تو کیا یہ لوگ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے، آخر اس بات کی کیا ضمانت ہے، میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ یہ ہم دونوں کو جان سے مار دیں گے، کیونکہ پہلے ہی انکل ذاکر کو قتل کر چکے ہیں اور جب مرنا ہی ہے تو قوم اور ملک کو فائدہ پہنچاتے ہوئے کیوں نہ مریں، کم از کم اس ڈائری کا پتا کیوں بتائیں۔ شائستہ کہتی چلی گئی۔

بات تو تمہاری بہت معقول ہے بیٹی ، لیکن میں کیا کروں، تم پر یہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ پروفیسر درد بھری آواز میں بولے۔

تو پھر ان سے ضمانت مانگئے کہ یہ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے۔ شائستہ بولی۔

ہوں ...... بولو، تم لوگ اس بات
کے جواب میں کیا کہتے ہو۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ڈائری ملتے
ہی تم دونوں کو چھوڑ دیں گے۔

ہم تمہارے وعدے پر کس طرح
یقین کر سکتے ہیں۔ پروفیسر بولے۔ ہماری
زبان پر تمہیں اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔

بہت اچھا ...... میں یقین کیے لیتا ہوں
کہ تم ہمیں چھوڑ دو گے، ڈائری میرے
گھر کے ......۔

ایک منٹ ابو! ایک بار پھر سوچ
لیجئے، کیا آپ کو ان کے وعدے پر
اعتبار ہے۔ شائستہ تڑپ کر بولی۔

ان حالات میں میں اور کر بھی
کیا سکتا ہوں، تم اب کچھ نہ کہنا ،
سنو ہمسٹر ...... ڈائری میری کوٹھی کے با
...... ابھی ان کے منہ سے یہ الفاظ

نکلے ہی تھے کہ انہوں نے دھم کی آواز سنی، وہ سب چونک اٹھے۔ پھر باس نے پستول شائستہ کی طرف تان کر کہا۔

تمہیں صرف تین سیکنڈ دیئے جاتے ہیں، تیسرے سیکنڈ پر تمہارے منہ سے ڈائری کا پتا نکلنا چاہیے۔

باورچی خانے میں چینی کے ڈبے کے اندر ، چینی کے نیچے۔ پروفیسر داؤد بولے۔

اس کے ساتھ ہی دروازے پر پوری طاقت سے ٹھوکر ماری گئی اور انسپکٹر جمشید دونوں ہاتھوں میں پستول تھامے اندر داخل ہوئے۔

انکل ! زندہ باد۔ شائستہ حلق پھاڑ کر چلا اٹھی۔

☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ڈائری کا اچار

ایک لمحے کے لیے پورے کمرے میں سب ساکت رہ گئے،ان کی نظریں انسپکٹر جمشید پر جم گئیں۔ باس تو انہیں اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کمرے میں کوئی بھوت گھس آیا ہو۔

"تم سب لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ " انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

تم اندر کس راستے سے آئے۔ باس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا اور ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ چھت کے راستے۔ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

ابا جان! کیا ہم بھی اندر آ جائیں۔ باہر سے آواز آئی۔ ہاں! آ جاؤ ...... حالات قابو میں ہیں۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

بہت خوب! فرزانہ کی آواز آئی اور تینوں اندر داخل ہوئے۔

اب پہلے تم پروفیسر صاحب اور شائستہ کو کھول دو اس کے بعد انہیں باندھنے کا کام کرنا ہے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

یہ کام تو ہمیں ہر بار ہی کرنا پڑتا ہے۔ فاروق نے منہ بنایا اور شائستہ کی طرف بڑھا۔ محمود پروفیسر داؤد کی رسیاں کھول رہا تھا۔

معاف کیجئے انکل ...... ہمیں آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اس نے کہا۔ اب بھی بہت وقت پر آئے ہو، ورنہ انہوں نے تو ڈائری کا پتا بتا دیا تھا۔ شائستہ نے جلدی سے کہا۔ کیا کہا۔ پتا بتا دیا تھا۔ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

ہاں! شائستہ بولی۔

بیٹی تمہیں یاد ہے ...... میں کیا بتایا تھا۔ پروفیسر مسکرائے۔

جی ہاں! آپ نے بتایا تھا ، ڈائری باورچی خانے میں چینی کے ڈبے میں چینی کے نیچے موجود ہے۔ شائستہ نے منہ بنایا۔

تو پھر ...... کیا ہمارے باورچی خانے میں کوئی چینی کا ڈبہ موجود بھی ہے؟ پروفیسر مسکرائے اور شائستہ چونک اٹھی اس کے منہ سے نکلا۔

اوہ...... ہم تو چینی مرتبان میں رکھتے ہیں، تو کیا ڈائری مرتبان میں ہے۔

نہیں! اس میں بھی نہیں ہے، بلکہ باورچی خانے میں ہے ہی نہیں۔ انہوں نے شوخ لہجے میں کہا۔

بہت خوب! میں دراصل انہیں دھوکا دینے کی کوشش میں تھے۔ انسپکٹر جمشید

مسکرائے۔

ہاں! تا کہ کچھ مہلت مل جائے، میں جانتا تھا، تم پہنچنے والے ہو گے۔

خدا کا شکر ہے ، آپ نے انہیں غلط پتا بتا دیا تھا، ورنہ میں آپ سے بہت دنوں ناراض رہتی۔ شائستہ نے کہا۔

بیٹی میں وقت گزار رہا تھا اور اگر میں جمشید کی طرف سے مایوس ہو جاتا تو تب بھی انہیں کچھ نہ بتاتا۔ انہوں نے کہا۔ بہت خوب انسپکٹر جمشید بولے۔

اتنی دیر میں دونوں کو کھول دیا گیا اور اب وہ تینوں نقاب پوشوں کی طرف بڑھے، انسپکٹر جمشید نے نقاب پوشوں کو دیوار کی طرف منہ کر کے ہاتھ پیچھے کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے فوراً تعمیل کی اور تینوں نے ان پانچوں کو چند منٹ کے اندر باندھ دیا ، پھر محمود

باس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اور اب ان کے کرتا دھرتا کی باری ہے۔

جونہی وہ اس کے نزدیک پہنچا، اس نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے پکڑ لیے اور اور اپنے آگے کرتے ہوئے بولا۔

خبردار انسپکٹر ...... پستول پھینک دو ، ورنہ میں اس کے بازو کلائیوں پر سے توڑ دوں گا، تم نہیں جانتے ، میرے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہے، اگر یقین نہیں آتا تو اپنے بیٹے سے پوچھ لو۔

انسپکٹر جمشید نے محمود کی طرف دیکھا اور سمجھ گئے کہ وہ سخت تکلیف میں ہے، انہوں نے فوراً پستول دور پھینک دیئے ، باس نے محمود کے دونوں ہاتھوں کو ایک ہاتھ میں تھاما اور دوسرے سے اپنا پستول نکال لیا، اس کے بعد محمود

کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

اب تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔

یہ سب کچھ چند سیکنڈ کے اندر ہو گیا تھا، ان کے چہرے لٹک گئے، لیکن انسپکٹر جمشید اب بھی مسکرا رہے تھے۔

محمود! ہم تمھیں اتنا کمزور خیال نہیں کرتے تھے۔ فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

تو پھر کتنا خیال کرتے تھے۔ کبھی بتایا کیوں نہیں۔ محمود نے چڑ کر کہا۔

فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے محمود ...... تم نے اس وقت بہت مایوس کیا ہے۔ فرزانہ بولی۔

تم دونوں کا خیال غلط ہے، محمود کا کوئی قصور نہیں، معلوم ہوتا ہے، یہ شخص غیر معمولی طور پر طاقت ور ہے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

ہاں تو پروفیسر ...... ڈائری کہاں ہے۔

باس نے پر غرور لہجے میں کہا۔

میں نہیں بتاؤں گا۔ انہوں نے کہا۔

تمہارے تو فرشتے بھی بتائیں گے۔

باس نے کہا۔

تو پھر انہی سے پوچھ لو۔ پروفیسر داؤد کی بجائے فاروق تلملا کر بولا۔

میں اکیلا تم سب سے سمجھ لوں گا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ پہلے ہمیں یہ بتا دو کہ اس ڈائری کا تم کیا کرو گے۔ اچار ڈالوں گا۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔۔ بھئی واہ ! ڈائری کا اچار ...... بھی کتنا لذیذ ہوتا ہو گا ...... جب تیار ہو جائے، ہمیں بھی دعوت دے دینا۔ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔ بکو مت۔ باس نے جھلا کر کہا۔

ہائیں! یہ میں بک رہا ہوں، تمہی نے تو اس اچار کا ذکر کیا تھا۔ تم

خاموش نہیں رہ سکتے۔ اس نے فاروق کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

ہاں! رہ سکتا ہوں۔ فاروق مسکرایا۔

حد ہو گئی۔ اس کے منہ سے نکلا۔

ہو گئی ہو گی، مجھے تو پتا نہیں۔ فاروق بولا۔

بھئی فاروق ...... ذرا کام کی بات کر لینے دو۔ انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔ جی بہت اچھا! جب آپ اس سے کام کی بات کر چکیں تو پھر بتا دیجئے گا، اس کے بعد میں اس سے بات کر لوں گا۔

بات تو میں بعد میں کروں گا، تم ذرا دھر آؤ۔ باس نے فاروق سے کہا۔

کیوں کیا کام میں کوئی بات کہنے کا ارادہ ہے۔ فاروق مسکرایا۔ ہاں ! ایک بات کہنی ہے۔ بہت اچھا، میں تم

سے ڈرنے والا نہیں۔ یہ کہہ کر فاروق اس کی طرف بڑھا۔ انسپکٹر جمشید اسے روکتے ہی رہ گئے، لیکن اتنی دیر میں باس فاروق کا ہاتھ تھام چکا تھا، اسے اپنی کلائی ٹوٹتی محسوس ہوئی، اور جان نکلتی محسوس ہوئی، اس وقت اس نے محسوس کیا، محمود کیوں بے بس ہو گیا تھا۔

کیا توڑنے کا اراد ہ ہے۔ اس نے بمشکل کہا۔

نہیں ...... تم میرا مذاق اڑا رہے تھے نا ......تمہیں اپنی طاقت دیکھا رہا ہوں۔ اس نے غرا کر کہا۔

بھئی اگر طاقت دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے دکھاؤ، بچوں پر کیا آزما رہے ہو۔ انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔ باس نے فاروق کا ہاتھ ایک دم چھوڑ دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرزانہ کے

پاس چلا آیا۔

تم اس کے پاس جانے کی حماقت نہ کرنا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

ہنہ ...... موقع ملا تو ضرور جاؤں گی اور اسے ناکوں چنے چبا کر آؤں گی......
فرزانہ نے منہ بنایا۔ بھئی اسے ناک سے چنے چبانے نہیں آتے۔ فاروق جلدی سے بولا اور پھر وہ چونک اٹھے۔

باس نے انسپکٹر جمشید کو گھورتے ہوئے پستول اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔
میں تمہیں اپنی طاقت ضرور دکھاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو پھرتی سے ایک طرف کھسک گئے اور وہ جھونک میں آگے بڑھ گیا، پھر جھلا کر پلٹا تو انہیں اپنے

سامنے پایا۔

لڑنے جھگڑنے سے پہلے یہ بہتر ہے کہ تم میری کلائیاں پکڑ کر توڑنے کی کوشش کرو۔ انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی اور اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ چند لمحے تک انہیں گھورتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر ان کی کلائیاں تھام لیں، اس نے محمود اور فاروق کی طرح ان کی کلائیوں پر بھی زور لگایا، دوسری طرف انسپکٹر جمشید اپنے جسم کی طاقت بازوؤں میں سمیٹ چکے تھے، چند لمحوں تک زور آزمائی ہوتی رہی اور پھر باس نے جھنجھلا کر ان کی کلائیاں چھوڑ دیں، ساتھ ہی دائیں ہاتھ کا مکا ان کی کنپٹی پر رسید کر دیا جو ان کے سر کے اوپر سے گزر گیا ، کیونکہ وہ نیچے جھک گئے تھے اور اسی وقت انہوں

نے اس کا دایاں ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا ...... دوسرا لمحہ حیرت میں ڈال دینے والا تھا ...... انسپکٹر جمشید نے زور لگایا اور کڑک کی آواز ابھری، ساتھ ہی باس کے منہ سے ایک زور دار چیخ نکل گئی۔

اس کی کلائی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں، وہ مارے درد کے فرش پر لوٹنے لگا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ آ جاؤ اکرام۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

اکرام اندر داخل ہوا اور کمرے کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ کیا میں اسے بھی لے آؤں۔ اکرام نے پوچھا۔

ابھی نہیں ...... پہلے ان کے نقاب نوچ لو۔ انسپکٹر جمشید نے پانچوں نقاب پوشوں کی طرف اشارہ کیا ...... اکرام نے آگے بڑھ کر ان کے نقاب اتارنے

شروع کر دیئے، ہر بار وہ چونکتا رہا ...... اور پانچویں کا نقاب اتارنے پر تو اس کے منہ سے حیرت زدہ آواز میں نکل گیا۔

ارے ......

پانچواں نقاب پوش شارو تھا، جس کا لاکٹ انسپکٹر جمشید کی لاش کے قریب ملا تھا، باقی چار نقاب پوش بھی عادی مجرم اور کئی بار کے سزا یافتہ تھے۔

تو تم اس شخص کے لیے کام کر رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے اس سے پوچھا۔

ہاں! اس نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

تو پھر شیخ سرفراز کے ہاں کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔انہوں نے پوچھا۔

شیخ سرفراز علی کون؟ محمود نے پوچھا، کیونکہ انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ انسپکٹر جمشید نے مختصر لفظوں میں شارو لاکٹ ملنے اور شیخ سرفراز علی کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرنے کا حال کہہ سنایا ...... یہ بھی بتایا کہ شیخ سرفراز علی ایک ریٹائرڈ فوجی ہے۔

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اب یہ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی بجائے اکرام نے کہا۔

اچھا ٹھیک ہے اکرام ...... اب تم اسے لے آؤ۔

جی بہتر۔

یہ کہہ کر اکرام کمرے سے نکل گیا اور وہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اکرام نہ جانے کسے لینے گیا ہے، تھوڑی دیر

بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی، وہی کتا کمرے میں کھڑا تھا جو پروفیسر ذاکر کی لاش کے نزدیک بیٹھا رو رہا تھا، اچانک وہ زور زور سے بھونکنے لگا، انہوں نے اس کے بھونکنے کی آواز پہلی مرتبہ سنی تھی ...... پھر اس نے شارو پر چھلانگ لگائی، لیکن اکرام نے زنجیر کھینچ لی، کتا شارو پر جھپٹ پڑنے کے لیے پورا زور لگا نے لگا اور اکرام کے لیے اسے روکے رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر زنجیر انسپکٹر جمشید نے تھام لی۔

تو پروفیسر ذاکر کو تم نے قتل کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ تمہارا لاکٹ بھی وہاں ملا تھا۔

یہ غلط ہے۔ شارو چلایا۔

اگر یہ غلط ہے تو کتا کمرے میں

موجود تمام لوگوں میں سے صرف تم پر ہی کیوں جھپٹ رہا ہے۔ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ تم لوگوں نے تھانے دار کو رشوت دے کر یہ کہنے پر آمادہ کیا تھا کہ لاکٹ کی گمشدگی کی رپورٹ دو دن پہلے لکھوائی جا چکی ہے، حالانکہ تھوڑی دیر پہلے ہی تم لکھوا کر آئے تھے، اب کہو، کیا کہتے ہو، کیا میں اس کی زنجیر چھوڑ دوں ...... انہوں نے کہا۔

نہیں نہیں ...... پروفیسر ذاکر کو میں نے ہی قتل کیا تھا اور باس کے کہنے پر قتل کیا تھا ...... باس کو یہی حکم ملا تھا ...... انہیں ڈائری کا پتا پروفیسر ذاکر کے اسسٹنٹ ریاض شاہد نے بتایا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب دوسروں کو زہریلی گیس سے بے ہوش

کیا جائے تو ساتھ میں اسے بھی بے ہوش کر دیا جائے تا کہ اس پر کسی کو شک نہ ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں بتاتا چلا گیا۔

سوال تو یہ ہے کہ یہ باس کون ہے؟ انسپکٹر جمشید بولے۔

باس ...... باس آپ کے سامنے ہے۔ شارو نے بوکھلا کر کہا۔

تو تم اپنے منہ سے نہیں بتاؤ گے کہ یہ کون ہے ...... خیر میں بتائے دیتا ہوں ...... یہ شیخ سرفراز علی ہے، وہی جس کے ہاں آج کل تم ملازمت کر رہے ہو۔ کیا !!

اکرام کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا ، محمود، فاروق اور فرزانہ بھی دھک سے رہ گئے۔ اگرچہ شیخ سرفراز علی کا ذکر انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے

ہی سنا تھا پھر اکرام نے اٹک اٹک کر کہا۔

لیکن ...... لیکن شیخ سرفراز علی سے تو ہم مل چکے ہیں ...... اس کی شکل تو اس سے نہیں ملتی۔

ہاں! شکل نہیں ملتی، لیکن ......اس سے کیا ہوتا ہے ...... ہے یہ شیخ سرفراز ہی ...... اور اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو ...... میں ابھی ثابت کر دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید لپکتے ہوئے باس پر جھکے اور اس کے چہرے منڈھی جھلی سی اتار پھینکی۔ اکرام نے وسل بجا دی اور بھاری بوٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

☆

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خونی بھی۔ کارآمد بھی

مجرموں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں، لیکن ابھی تک ڈائری کا معاملہ جوں کا توں تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔

پروفیسر صاحب، جہاں تک میرا خیال ہے، اس ڈائری میں کسی ایجاد کا فارمولا ہے۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے ...... میں پروفیسر ذاکر کی کوٹھی کے اندر گیا تو وہ ڈائری جیب میں لیے بیٹھے تھے، انہوں نے میرے بیٹھتے ہی ڈائری نکال کر میرے حوالے کر دی، اور پھر فوراً وہاں سے روانہ ہونے کے لیے کہا، باہر نکلتے نکلتے انہوں نے اشارۃً بتا دیا تھا کہ اس میں کسی قسم کی ایجاد کا فارمولا درج ہے ...... دراصل مسئلہ یہ ہے کہ

آج سے پچاس یا ساٹھ اس کے کچھ عرصہ بعد دنیا میں خوراک کے ذخیرے بالکل ختم ہو جائیں گے، آبادی اس قدر بڑھ جائے گی کہ دنیا بھوکوں مرنے لگے گی، پیداوار کسی طرح بھی نہیں بڑھائی جا سکے گی، اس وقت دنیا بھر کے سائنس دان پریشان ہوں گے کہ کیا کریں، ہر ملک کی حکومت کو اپنے عوام کی پڑی ہو گی، پروفیسر ذاکر نے اس وقت کو بھانپ لیا تھا اور وہ اس جستجو میں تھے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کر ڈالیں جو آنے والے وقت میں ہمارے کام آ سکے، وہ تجربات کرتے رہے، کرتے رہے اور آخر انہوں نے ایک فارمولا ایسا تیار کر ہی لیا کہ اس کے ذریعے فصلوں کو دس گنا تک بڑھایا جا سکتا ہے ...... تیار ہونے والی

اس دوائی کو بیجوں پر چھڑک کر بو دیا جائے تو فصل پہلے کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہو گی اور ایک کھیت پر صرف پانچ روپے کی دوائی کام کر جائے گی۔

اوہ! اتنا سستا اور کار آمد نسخہ ...... ہم تو اسے خونی ایجاد خیال کر رہے تھے۔ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

ایجاد تو یہ خونی ہی ہے ...... اور اس کی حفاظت کے لیے حکومت کو نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

کیا مطلب؟ وہ چونکے۔

مطلب یہ کہ نہ جانے کتنے ممالک کے جاسوس اس ایجاد کو اڑانے کے چکر میں پڑ جائیں گے ...... ابھی تک تو صرف ایک ملک کے جاسوسوں کو خبر

ہوئی ہے اور وہ بھی ان کے اسسٹنٹ کے ذریعے، ابھی اسے بھی تو گرفتار کرنا ہے، اکرام اس کی گرفتار کے لیے یہیں سے کچھ آدمی روانہ کر دو۔ انہوں نے کہا۔

جی بہت بہتر۔

ابا جان! سوال یہ ہے کہ پروفیسر ذاکر کا اسسٹنٹ شیخ سرفراز تک کیسے جا پہنچا۔ فرزانہ نے پوچھا۔ یہ تو بہت سیدھی سی بات ہے، شیخ سرفراز علی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے، یہ انہی چکروں میں رہتا ہے، جو آدمی لالچی یا کمزور نظر آیا ہے، اسے ورغلا کر معلومات حاصل کرنے کے چکر میں رہتا ہے، اس طرح یہ ریاض شاہد سے بھی مل بیٹھا اور اس نے محسوس کیا، ایک لالچی آدمی ہے ، آسانی سے خریدا جا سکتا ہے، بس اس

نے اس سے معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں اور اس طرح اسے اس فارمولے کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ بتاتے چلے گئے۔

لیکن شیخ سرفراز تو ریٹائرڈ فوجی ہے، آخر یہ دشمن کا ایجنٹ کس طرح بن گیا۔

یہی تو ہماری بدقسمتی ہے کہ فوج میں بھی چند ایسے لوگ شامل ہیں، پچھلی جنگ میں ہمیں دراصل ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے تو نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

اوہ! ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

اور وہ اس خونی ایجاد کے بارے میں سوچنے لگے، جس کی حفاظت بہت مشکل کام تھا اور یہ مشکل حکومت کو پیش آنے والی تھی۔ آخر فرزانہ نے

سوال پوچھ ہی لیا۔کیا ہم اس ایجاد کی حفاظت کر سکیں گے۔

ہاں! امید تو ہے ، اس سلسلے ،میں میرے ذہن میں چند تدابیر ہیں ، میں وہ تدابیر حکام کو بتا دوں گا، انہوں نے عمل کیا تو اس کی حفاظت ہوتی رہے گی، اور اس پر عمل بھی شروع ہو جائے گا، تا کہ ہم ابھی سے دس گنا غلہ پیدا کر کے غذائی بحران کو حل کر سکیں، اور اپنے مسلم مما لک کی مدد بھی کر سکیں۔ انہوں نے کہا۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کے ذہن میں کچھ تدابیر آ گئی ہیں، ورنہ ہمیں فرزانہ سے مدد لینا پڑتی۔ فاروق نے معصومانہ انداز میں کہااور سب مسکرانے لگے۔

THE END-------- ختم شد